حیات تسلیم

یعنی

ہمپایۂ قدسی و کلیم منشی مولوی شیخ امیر اللہ صاحب تسلیم
لکھنوی کی سوانح عمری

مصنفہ

منشی ضمیر الدین احمد صاحب عرش تعلقدار و رئیس گیا
و مصنف ناول ثمرۂ نافرمانی و رسالہ عروض و قوافی وغیرہ

جس کو

منشی محمد الدین صاحب فوق مالک و منیجر
پبلک بک ایجنسی لاہور نے باخذ حقوق تصنیف
اپنے اہتمام و انصرام سے
[illegible] چھپوایا

قیمت ۱۲؍



تصویر حضرت جناب لطف مآب قدسی و کلیم منشی شیخ امیر اللہ صاحب متخلص بہ تسلیم لکھنوی

مخمس

بر دو اشعار ملک الشعرا و استاذ تسلیم - کہ برائی درج حیات تسلیم پائے ہین۔

از حقیر عرش تلمیذ تسلیم مدظلہ و مصنف حیات تسلیم

گرچہ ہون رشک صبا اور وزیر
ہند مین آپ ہون ہین اپنی نظیر
ہے اسی طرح جو اپنی تقدیر
ہو چکی حشر مین اس کی توقیر
زندگی مین نہ ہوئی جب تعظیم

حالتین عرش نے کین گرچہ رقم
قدردان ہی نہ رہے وائے ستم
مجھ مین تسلیم کہان وہ دم خم
دونون عالم مین ہین یکسان ہم
مرگ تسلیم و حیات تسلیم



آمد

صبح ہو گئی بزم میں اک سناٹا ہے رات جو لوگ اپنے لغمۂ کلام سے دل خوش
کر رہے تھے اس وقت نظر نہیں آتے صرف ایک شمع رہ گئی ہے وہ بھی خدا جانے کس
خیال میں زار زار رو رہی ہے نسیم سحر کے جھونکے اوسے چھیڑتے ہیں اور وہ چپکے
سے جھلملا کر رہ جاتی ہے۔ اور کوئی اس بزم میں ایسا نہیں جس سے کچھ اگلی صحبتوں
اور قدیم بزرگوں کا تذکرہ سنوں مگر یادگار روزگار کی طرح یہی ایک شمع رہ گئی ہے وہ بھی
اپنے خیال میں مبتلا ہے۔ نہ میری سنتی ہے نہ اپنی کہتی ہے۔ رات کے بچھے ہوئے
فرش پر گلستان نظم کے کچھ خوش رنگ پھول پڑے ہیں جن سے کمال کی خوشبو
آتی ہے مگر افسوس کہ وہ باسی ہیں پھر کیف میں گلچین باغ نظم ہوں اوسے چنکر دامن
آرزو بھر لینا اپنا فخر جانتا ہوں کہ اگلے اساتذہ کے فیض سے بھی محروم نہ رہوں۔

میرے دوستو یہ وہی بزم ہے جہاں رات سودا و درد و نسیم دہلوی و مومن خاں
شیفتہ غزل سرائی کر رہے تھے۔ اور اس وقت اون کی یادگاروں میں حضرت
استاذی ملک الشعرا شیخ امیر اللہ صاحب تسلیم لکھنوی شمع صفت اس دور
کے لوگوں کے جانے والوں کی وضع اور آثار کو دیکھ کر چپ ہیں مدت سے میرا ارادہ تھا کہ
اس یادگار سودا و درد کی سوانح عمری لکھ کر قدردان اہل کمال سے محنت کی داد لوں
کہ میرا نام سعادتمند شاگردوں میں صفحۂ ہستی پر درج ہو کر یادگار رہے۔ مگر کل امور کے
لئے اوقات مقررہ کا انتظار ضرور ہے۔ دوسرے زمانہ کے تغیرات نے جیتے جی
مار ڈالا اور اگلے تاجر کہ صنعتوں کے قدردان تھے وہ بھی اوٹھ گئے اونکے کارخانے
درہم برہم ہو گئے اہل کمال کی قلمی کتابیں عطاروں کی پڑیا بنانے کی غرض

سکتا ہوں۔ مدت کے بعد باغ تمنائی میں بہار آئی جناب منشی محمد الدین صاحب فوق اڈیٹر اخبار پنجۂ فولاد کے کہ میرے قابل دوست اور قدر دان ہیں حیات تسلیم کی قدر دانی کی۔ خدا سلامت رکھے۔ اسوقت لاہور عجب مقام ہے اور کیوں نہ ہو کہ یہاں کی فرش زمین پر بڑے بڑے اہل کمال بیٹھے ہیں۔ اے لاہور تیری خوش قسمتی پر دلی یاد آتی ہے

ہائے افسوس جسوقت یہ تذکرہ مرتب ہوا تھا مگر منشی امیر احمد امیر مینائی اور میر خورشید علی نفیس لکھنوی زندہ تھے۔ آج نگاہیں ہر طرف دوڑا کر انکو دیکھتا ہوں مگر پتا نہیں ملتا۔ کل کی باتیں کہانیاں ہوگئیں ؎ عرشؔ

زندہ جو کل تھے آج اونہیں کا فسانہ ہے
کس کس کو رو لیے یہی رنگ زمانہ ہے

بندہ عرشؔ کفش بردار استاد تسلیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس آفتاب سپہر نظم کی روشنی اقلیم معانی میں مدت سے پھیلی ہوئی ہے جہاں شہرت کا ہر ذرہ اختر پر نور کی طرح فیض کرم سے روشن ہے اور اسکی روشنی کی اہل نظر کی آنکھوں میں جگہ ہے اوسکے آگے اور سخنداںوں کا چراغ قطرہ شبنم کی طرح فنا کا دم بھر رہا ہے۔

یہ اوس باغ سخن کا گل سرسبز ہے جسکے نخلبند سودا اور درد دہلوی تھے۔ یہ وہ آئینہ ہے جسکی نشو سے باغ عالم میں آجتک نسیم دہلوی کا طوطی کلام زمزمہ پرواز ہے۔ اس کا کلام باغ مقبولیت کا وہ پھول ہے جسکو گلاب کی طرح ہر باغ اور گلدستوں کی طرح ہر محفل میں پاتا ہوں۔

یہ زمین کمال کا وہ بحر ناپیدا کنار ہے جس سے لاکھوں بہجہ تشنہ کام سیراب ہوئے سینکڑوں قطرے زیادہ گوہر آبدار بنگئے تو سیراب ہوگئے اور خشک نہیں آجتک اس بحر کا ہر قطرہ وفور دریا دلی سے جام آسمان کو لبریز کرنیکی ہمت رکھتا ہے اللہ رے ظرف دماغ۔

اس شہنشاہ ملک سخن کے سر پر علم معانی کا وہ مرصع تاج ہے جس میں گوہر فصاحت و الماس بلاغت ستاروں سے زیادہ درخشاں ہیں ان جواہرات کے پرکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس تاج کا ہر گوہر ماشاءاللہ ہفت اقلیم اور بحر و کان کے تاروں سے بھی زیادہ قیمتی ہے ان جواہر پاروں کے قدردان چل بسے۔

جب یہ بادشاہ کمال عالم ارواح سے سیر کشور اجسام کرتا ہوا جہان نظم کی طرف چلا تو مکان قدرت کے دروں سے اسکے نفیس پردے اوٹھ گئے نوشتہ تقدیر بدیہی چیزوں کی طرح ساکنان فلک اور اہل زمیں پر آشکارا ہوگیا فرشتوں نے تاج مبارک پہناکر کہا کہ تو شہنشاہ اقلیم سخن ہے تجہ پر ہند کی قدیم شاعری ختم ہوگئی تیرے قدردان بھی بادشاہی ہوگئے۔ لکھنؤ تجھے بزم سخن کا تخت تجھے نصیب ہوگا۔ سچ ہے۔ آخر وہی ہوا۔ اس وقت لکھنؤ اور دہلی کے اساتذہ آپ ہی کو مستند فرماتے ہیں اور کہنہ مشق کہتے ہیں

نسیم

تسلیم باغ دہر میں خوشبو نسیم سے ٭ کہتی ہے خلق بلبل ہندوستاں مجھے

اب زنگ زمانہ اور ناقدر دانی کیوجہ سے ہرگز امید نہیں کہ پھر ایسا قادر
اوستاد دنیا میں پیدا ہو اور یہ عزت حاصل کرے کہ اوستاد تک اوستاد ہیں۔
ہر چند کمبخت دہریوں کے منہ میں زبان ہے بہتیری فرمائینگے کہ شاگردنے بہت
بڑھا دیا مگر انصاف کی عینک سے اگر اس سچے تذکرے کو دیکھیں گے تو مصنف
آبحیات کی طرح مجھے بدنام نہ کرینگے غریب ہمدرد آزاد دہلوی بھی بدنام ہے
اور وہ صرف اس وجہ سے کہ اوستاد کی اتنی تعریف کی۔

نام اور حالت وطن

آپکا اسم گرامی احمد حسین اور عرف امیر امد ہے۔ عرف مشہور عالم ہے تخلص
آپکا تسلیم ہے۔ آپکے والد مرحوم کا اسم گرامی مولوی عبد الصمد تھا۔ آپکے آبا اجداد کا
اصلی وطن قصبہ بدیع السرا عرف بدوسرائے مضافات دریاآباد ہے۔ مگر قصبہ
نا کو ر چھوڑ کر فیض آباد اودھ میں مقیم تھے۔

وطن چھوڑنیکی وجہ

اے نئی روشنی والے نوجوانو عینک لگی ہوئی آنکھوں سے ادہر دیکھو۔
اگلے بزرگ نوکری حتی المقدور نہیں پسند کرتے تھے اپنے نسب نامہ کو الٹ
کر دس بیس پشت کے لوگوں کی حالتوں کو دیکھو انہیں تمہاری طرح ملازمت پر
فخر نہ تھا زراعت سے اُنہیں دلچسپی تھی بڑے بڑے کھیتوں کی سیر پسند تھی
آپکے والد مولوی عبد الصمد صاحب مغفور زمینداروں کی مال فیاضی کیا
کرتے تھے اور وہی معاش کا ذریعہ تھا اور دو گاؤں حسن پور اور بہاڑپور بزرگوں
کی یادگار بطور زمینداری کے رہی تھے۔ ایک مرتبہ اتفاق وقت کہ روپیہ وصول
نہ ہوا گیارہ ہزار روپیہ باقی ہوگیا ناظم دریاآباد نے سخت طلبی کی یہاں تک کہ
آپکے والد اور بڑے بھائی منشی عبد اللطیف صاحب دونوں قید ہوگئے اور
ناظم نے ہر طرح کی تکلیف دینی شروع کی آپکے دادا صاحب زندہ تھے۔
اون کو تاب نہ آئی اور اولاد کی یہ تکلیف دیکھی نہگئی جسقدر سرمایہ گھر میں موجود

[illegible] تک اور یہ دونوں گاؤں راجہ رام سنگھ و ہم چند لیکھ پال کے پاس گرو رکھ کر آپکے والد و جد صاحب بیاجی کو قید سے چھڑایا اور روپیہ ادا کر دیا۔ ریاست چونکہ اپنے مرہونہ گاؤں میں رہنا گوارا نہ کیا اس لئے آپکے بزرگ فیض آباد اودھ میں آکر آباد ہوئے۔ مگر وہاں بھی گردش ایام کا چتر سر پر پھرتا رہا آپ کے والد نے مستقل طور پر رہنے دیا نوکری کی فکر نے دائرہ لکھنؤ میں لاکر صورت پیٹ کا پھیرا یا۔ آخر یہاں آپکے والد صفدری نام ایک پلٹن میں اوشدار ہوئے (اوشداری ایک عہدہ کا نام تھا کہ پانچسو آدمی کا افسر ہوتا تھا) تیس روپیہ ماہوار آپکے والد کو ملا کرتے تھے۔ جب آپ کی عمر دس بارہ برس کی ہوئی تو اوسی پلٹن میں سفارش وغیرہ سے چہرہ ہو گیا نوکری وغیرہ نہیں کرنی پڑتی تھی مگر پانچ روپیہ ماہوار ملتے تھے۔ مختصر یہ کہ لکھنؤ کو آپکے وطن ہونے پر فخر ہے

حالت تعلیم

آپ نے فارسی کی کتابیں اپنے والد اور مولوی شہاب الدین صاحب مغفور شاگرد میرزا ناطق گرانی سے اور عربی کی کتابیں اپنے بڑے بھائی سے کہ علامہ دہر فاضل جلیل القدر مولوی ولی اللہ صاحب مغفور کے شاگرد تھے پڑھیں (یہ وہی مولوی ولی اللہ صاحب ہیں جنکے انتقال کی تاریخ کلیات تسلیم میں یوں مندرج ہے)

قطعہ تاریخ وفات حقیقت آگاہ معرفت دستگاہ حضرت شاہ ولی اللہ بھٹرائچی قدس سرہ

آہ جب حضرت ولی اللہ شاہ بحر سیر روضۂ رضواں چلے
خامہ تسلیم نے لکھا یہ سال ۔ بادشاہ کشور عرفاں چلے

۱۲۸۳ھ

اکثر آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ہمارے اوستاد مولانا محمد عبد الاحد صاحب مستفاد فرنگی محل لکھنؤ کے بزرگوں کے فیض سے ہمیں چار حرف آگئے ہیں

حضرت استاد کو میں باوجود بستی مقدور ہو کر جانتا ہوں وہ ماہر فن اور عالم اقدس ہیں بارہا یہیدان قرش کے پاس اس مضمون کے اکثر سرفراز نامے بھی موجود ہیں۔
آپ خوشنویس بھی ہیں اور اس فن میں آپ کو منشی عبدالحی صاحب سندیلوی سے کہ آپکے والد کے بڑے دوست تھے تلمذ حاصل ہے۔ چنانچہ کلیات تسلیم آپ کے قلم سے لکھا ہوا مطبوع ہوکر صفحہ ہستی پر یادگار ہے۔ وصفحہ ۳۱۳ کلیات تسلیم) میں ہمارے مکرم منشی قدراعلی صاحب عیش مرحوم لکھنوی کہ کہنہ سال مشاق تھے تقریظ میں لکھتے ہیں کہ (یہ تصحیح تمام و تنقیح مالاکلام بخط خاص مصنف علام طبع ہوکر مطبوع طبائع عشاق انام و پسندیدہ کافۂ خاص و عام ہوا) اسے سبحان اللہ کیا پختہ خوشخط حرف ہے۔
فن شاعری میں آپ نواب میرزا محمد اصغر علیخان نسیم دہلوی شاگرد رشید مومن خاں دہلوی کے شاگرد رشید ہیں (یہ وہی مومن خاں ہیں جنکی ہمعصری پر غالب مرحوم کو فخر تھا یہی دو اوستاد اپنے رنگ میں آجتک یگانہ تسلیم کئے جاتے ہیں) اور آپ سے تلمذ کا ایک خاص سبب ہوا وہ یہ کہ آپکے بڑے بھائی منشی عبداللطیف صاحب حضرت نسیم دہلوی کے بڑے دوست تھے۔ حضرت اوستاد مدظلہ علم عروض و قوافیہ میں یگانۂ روزگار ہیں ہندوستان میں موہوم ہے۔ بارہا یہیدان کہ لاینحل سمجھے بات کی بات میں معرے کی طرح آپ نے حل کر دی۔
نئی روشنی والے دوستو! اگلے لوگوں کی محبت اور حالت ہی اور تھی وہ پختہ وضع لوگ تھے۔ اونکا کیا کہنا۔ حضرت اوستاد اوسی گئے ہوئے قافلہ کی یادگار ہیں۔ دیکھو شاگردی کے مد میں کسقدر اگلے ارتباط کی پابندی کی اب تو وہ زمانہ ہے کہ کسی کی دوستی اعتبار کے لایق نہیں اور اگر تھے تو آجکل کے انگریزی دوستوں کا شمار تاروں سے زیادہ ہے ایک شیشی لیمنڈ اور ایک بکس سیگار میز پر رکھ لیجئے اور تماشا دیکھئے۔ اب وہ پکی محبت کہاں۔ اگر غور سے دیکھو تو اس اندھیری دنیا میں یہی ایک شمع رخ ہے۔ جسکی روشنی جہان میں پھیلی ہوئی ہے۔ ورنہ وہ زمانہ وہ لوگ

[illegible]
حق سکوں۔ ما بجے شعر اور آجکل کی گیتوں کے جلسوں کے منتظم اس قابل ہیں جو حضرت تسلیم مدظلہ کے شاعری کے رنگ کو سمجھ سکیں۔ اسے غالب خدا جانے کیا کہہ گیا

ع اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

سلسلہ شاعری کا حال

میں نے ربے سبے اگلے بزرگوں سے پوچھا اور تذکرہ آبحیات دیکھا۔ مصنف آبحیات کی تحقیق میرے خیال میں ضرور اعتبار کے لائق ہے۔ حضرت اوستاد کی شاعری کا سلسلہ سودا۔ اور درد دہلوی سے ملتا ہے اور وہ یوں کہ حضرت تسلیم لکھنوی نسیم دہلوی کے شاگرد ہیں اور نسیم مومن خاں صاحب کے شاگرد اور مومن شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد تھے اور نصیر شاہ محمدی مائل کے شاگرد تھے اور مائل شاگرد قیام الدین قائم مرحوم کے تھے۔ اور قائم میری طرح دو اوستادوں کے شاگرد ہوئے یعنی سودا اور درد دہلوی سے مشورت لی۔ اس تحقیق میں حقیر کا بہت بڑا وقت صرف ہوا حضرت تسلیم مدظلہ سے بھی اسکی تحقیق کی اوستاد نے فرمایا کہ اسکی تحقیق کامل طور پر تو مجھے نہیں ہے مگر کسی قدر ہے مصنف آبحیات کا بیان قابل اعتبار ہے اے سبحان اللہ اور سودا اور درد خود تو خداوند سخن ہو اور یہ اون کی یادگار ہیں سر دست لکھنؤ میں یوں تو اکثر شاگرد حضرت نسیم دہلوی کے ہیں مگر یہ شہرت اور مقبولیت عام کا تمغہ کسی کو نصیب نہیں لکھنؤ تو لکھنؤ دہلی کو اگر آپ کی ذات پر فخر ہے تو بیجا نہیں کیونکہ دہلی کی مردہ شاعری اور وہاں کے بزرگوں کا نام اسی پیغمبر آخر زمان نظم سے دنیا میں قائم ہے۔

ہیچمدان ۱۳۱۱ھ میں بنارس ہوتا ہوا لکھنؤ گیا وہاں۔ کرمی میر خورشید علی نفیس چراغ خاندان انیس زندہ تھے ملے دیر تک ادہر ادہر کا تذکرہ رہا۔ اس کہنہ سال نے بھی حضرت اوستاد تسلیم کا نام بڑے اعزاز سے اپنی زبان پر لا کر یہی کہا کہ ایسے شعرا کو جانے دیجئے یادگار سلف اور مستند ہیں تو یہی ہیں اور غزل گوئی اردو کی انہیں سے قائم ہے جن آنکھوں میں اس

وقت بعض عدم کی یہی نمود پھر رہی ہے آنکھوں میں ہیں۔ کہاں ہے نشاں

آپکی اولاد کی حالت

چراغ تلے اندھیرا۔ کیا کہوں۔ خدا جانے یہ کس دل جلے کا قول ہے۔ میں نے حضرت استاد سے پوچھا کہ اپنے صاحبزادہ کی حالت کہئے۔ آپ نے ایک آہ سرد کھینچکر جو کچھ فرمایا بعینہ لکھتا ہوں (اس سے اون کے قیام کی حالت بھی ظاہر ہوگی)

میرا ایک لڑکا تجمل حسین نام پہلی بی بی سے تھے وہ لکھنؤ میں رہتا ہے شادی بھی کی آوارگی مزاج میں ہے حافظ قرآن تھا قرآن بھلا دیا۔ استعداد علمی بہت کم ہے تحاصات سے چھاپہ خانہ میں کچھ دس بارہ روپیہ کی کتابت کر لیتا ہے۔ اور سات روپیہ ماہوار میں دیتا ہوں۔ مکان میں رہتا ہے شاعری سے اوس کو کچھ بحث نہیں کہنے کو اوس کا یہ پتہ ہے (شہر لکھنؤ محلہ محمود نگر قریب مقبرہ اسد علی شاہ)

ع اے کمال افسوس ہے تجھپر کمال افسوس ہے

اس دلخراش تقریر نے آنکھوں سے آنسو جاری کر دئے آسمان کی طرف دیکھ کر خوش میں بیٹھا ہوں۔

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوش اشک سے بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

ہائے ایسا استاد زمانہ شاعر یگانہ اور اوسکے لڑکے کا یہ حال کہ کوئی نہیں جانتا۔ ایسے ہم خیال دوست ہائے کوئی ہمدرد بھی نہیں جسکے گلے لگ کر اس بے سر و سامانی پر چار آنسو بہائیں۔ ان باتوں کو سوچتا ہوں تو بیٹھے بیٹھے دماغ میں جنون کا مادہ پیدا ہوتا ہے خدا گواہ اس وقت آنکھوں میں آنسو موجود ہیں۔ اسے ناصح نادان تو ان باتوں کو کیا جانے منہ میرا کب تک دھوئیگا بچے تو برابر ہی ہوتا ہے لیچ ہے۔ ہمارا ہم خیال آزاد مصنف آبحیات خبط نہ ہوتا کیا ہوتا۔ اوس کے سامنے تو دنیا ہی شاعری کی الٹ گئی (اس دکھدرد کو ہم اہل درد سے پوچھو یا جسے چاہے عمل چیر کر دکھاؤ بجز ان تخیلات کے ایک بوند خون نکلے تو

تحقیق حقیر عرش

اس میں شک نہیں کہ حضرت تسلیم کا رونا سچ ہے مگر پھر بھی جانے شکر ہے کہ منشی تجمل حسین صاحب ایک میرے معزز ہمدرد ہیں دشمنوں سے خدا بچائے مجھے جیتا ہو شدلا ہوری نے ایک بار . لاہور سے لکھا کہ آپ کس خیال میں بیٹھے ہیں اسوقت ایک صاحب رامپور سے آئے ہیں اون سے معلوم ہوا کہ آپکے اوستاد ملک الشعرا تسلیم راہی ملک بقا ہوئے۔ خدا دیکھ کریں فرط حسرت سے نقش دیوار ہو گیا اب نہ تو مردہ تا ہوں نہ بولتا ہوں۔ بتلائے آفتاب غروب ہو جائے اور اخباری دنیا میں خبر نہ ہو۔ تھوڑی دیر بعد ہوش آیا کہ اسے ہر چند لکھنو اور دہلی میں اور اوستاد موجود ہیں۔ مگر اونکے جوڑ کا کون ہے اب اپنا دیوان کس کو دکھاؤں جن آنکھوں سے کہ ناسخ مرحوم کے دیکھنے والے کو دیکھ چکا ہوں تو اور کس کو دیکھوں۔ بہتر ہے کہ اپنے کلیے دیوان کی طرح اس دیوان کو بھی جلا کر دل کی لگی بجھاؤں لیجیے دیوان عرش نے ایک دیوان بنارس میں عاشقانہ صاف رنگ کا لکھا تھا ناسخ مرحوم کے کفش بردار ہوں کی صحبت میں وہ کلام ناپسند آیا آخر بیس جزو کا دیوان جلا کر بیٹھ رہا۔ مگر پھر استقلال نے اپنے دامن سے آنسو پوچھکر کسی قدر اطمینان دیا اور نشان منشی تجمل حسین صاحب کا موجود تھا اونکو خط لکھا۔ میرے مہربان نے بڑی تشفی کے ساتھ ایک عنایت نامہ بھیجکر یہ لکھا کہ یہ خبر محض غلط مشہور ہے۔ اوس کے بعد حضرت اوستاد نے بھی رامپور سے تشفی کی۔ غرض اس کہنہ سال سن رسیدہ کی بابت اکثر ایسی خبریں اوڑی ہیں اور بارہا پورب کے بوڑھے شاعروں نے مجھکو دیکھکر حیرت کی نظر سے پوچھا ہے کہ کیا اوستاد تسلیم زندہ ہیں۔ اور اس کا خاص سبب ترک سخن ہے

میرے دوستو یہاں اس عبارت سے صرف غرض یہ ہے کہ میں نے منشی تجمل حسین صاحب کی تحریر دیکھی استعداد معقول تھی اور عبارت دلخراش جدا آپ ہیں اگر ذوق سخن عطا کرے تو اپنے والد کا نام روشن کر سکتے ہیں کیونکہ پانی کا ایک

قطرہ کنار صدف میں رہ کر گوہر ہو جاتا ہے۔

اور متعلقین کی مختصر حالت

حضرت تسلیم مدظلہ کے صاحبزادہ منشی تجمل حسین صاحب کی والدہ مدت ہوئی کہ لکھنؤ اپنے وطن سے آئیں اور ہیضہ میں مبتلا ہو کر قضا کر گئیں۔ پھر دوسری شادی وہیں کی منشی تجمل حسین صاحب کی یہ والدہ ابتک رامپور میں تھیں ۱۳۳۵ھ میں قضا کر گئیں ایک دم ساز اما قدیم وقت کی رہ گئی تھی افسوس وہ بھی ہیضہ میں مبتلا ہو کر راہی عدم ہوئی۔ آخر وقت میں اس نے نمک کا بڑا پاس کیا اور استاد کی بہت خدمت کی۔ اب استاد کی بیکسی پر رونا آتا ہے۔ اور اسپر یہ بیان آپ پیچھے اور رلا دیتا ہے کہ بھائی اب میرا زمانہ آخر ہے کہیں نوح دیگر بجواب تو ہو اسپہ میں اپنا کون ہے سارے خانہ ویرانی تیرا پڑا ہو۔ ضعیفی کا عالم اور ہی ستم بتمہ مرض۔ جو حضرت تسلیم کی غلامی پر فخر کرتے کرتے مر جائیگا حیف چاہتا ہے کہ کیا کو ترک کر کے رامپور چلا جائے۔ اور آخری وقت میں استاد کا ساتھ دے۔ مگر اسے دکھ درد کے سمیٹے والو متعلقین کو کس پر چھوڑ جاں۔ دگلی فارغ البالیاں جاتی رہیں گھر تباہ ہو گئی لڑکے کا قرضدار ہوں لگا ہے کتاب ہے کی تربیت بھی خدا پناہ دے۔ تو جاتے شکر ہے۔

حال ملازمت اول

"میرے دوستو۔ آخر مجبوری نے تباہ کر کے ملازمت کا خوگر کر دیا۔ اب بتاؤ ملازمت نہ کرتے کیا کرتے؟"

محمد علی شاہ بہادر خلد آشیان کے زمانہ میں آپکے والد بہت بیمار ہوئے امید زندگی کی نہ رہی۔ بادشاہ کے حضور ایک عرضی پیش کی مضمون یہ تھا کہ خانہ زاد بہ سبب پیرانہ سالی و علالت قابل بجالانے خدمت کے نہیں رہا۔ امیدوار کہ میرا لڑکا مسمی محمد امیر اللہ کہ نوجوان اور پڑھا لکھا ہے میری نوکری پر عوضی مقرر ہو جائے،

" تھے زمانہ اوس وقت نوکریاں اپنے وارث کے رہتے ہوئے دوسرے کو نہیں دی جاتی تھیں" چنانچہ اوس عرضی پر حکم ہوا کر موافق سوال سابق عمل آمد ہوا اور آپ اپنے والد کی جگہ پر اوشدار ہوکر پلٹن میں رہنے لگے تیس روپیہ ماہوار ملنے لگا مدتوں رہے اور اوس زمانہ میں حضرت نسیم دہلوی اور اونکے ہمعصر اوستادوں کی صحبت میں برابر بیٹھتے اوٹھتے۔

اے دوستو یہ اور ہی زمانہ تھا۔جس وقت کا یہ قصہ ہے اوس کا تو ڈکینگر لیمپوں۔ یہ گورے چہرے والے یورپین ہی شاید کہیں کہیں ہوں۔ ورنہ شاہی زمانہ تھا ہمارے علم عربی و فارسی کی قدر تھی۔ الہی تو نے زمانہ کا ورق کس طرح الٹ دیا۔ میری آنکھیں اوس وقت کی لکھی ہوئی عبارت کو پڑھنا چاہتی ہیں۔

حضرت اوستاد مدظلہ فرماتے ہیں کہ یہ وہ زمانہ ہے جو میں نے ناسخ اور آتش کو دیکھا۔ اپنی آنکھوں کی دیکھی ہوئی حالت فرماتے تھے کہ ٹکسال جو محلہ چوک لکھنو میں موجود ہے ناسخ وہیں رہتے تھے۔صبح و شام پھاٹک پر آبیٹھتے تھے چند لڑکے نابالغ سے ہنسی دل لگی کر کے لڑکوں کو کچھ سودا کھانے پینے کا دلوا کے اپنے کمرے میں جا بیٹھتے تھے پھر شاگردوں سے یا اور احباب سے صحبت رکھتے تھے۔

اے اوستاد ناسخ۔ آج تم کہاں ہو۔خدا کے لیے اپنی زیارت سے خواب ہی میں مشرف کرتے۔ تمہارا عاشق کہاں عرش خستہ جگر تمہارے دیوان کو دیکھ دیکھ کر روتا ہے ؎

یاد آتے ہیں مجھے حضرت ناسخ جو قریب

کیا ہی اشکوں کی لگاتی ہے جھڑی میری آنکھ

آتش مرحوم کی حالت اپنی آنکھوں کی دیکھی یہ فرماتے تھے کہ میں نے آتش کو بہت دیکھا ہے جس محلہ میں میں رہتا تھا اوسی محلہ میں وہ تھے انکے بیٹے محمد علی جوش سے بھی ملاقات تھی اوس وقت میں آتش کی یہ وضع تھی داڑھی چڑھاتے تھے لنگی باندھتے اور ڈھیلے ڈھالے انگرکھے پہنتے تھے۔ ان سے اور ان کے

ملاقہ شاعرانہ محبت سے ملاقات تھی کیا کہوں وہ کیا زمانہ تھا
آہ ئے زمانہ تو نے مار ڈالا - اے زندگی پر اکڑ نے والو سدحال رونے کا ۔
پوچھو سر سے بس جا نے دو - ابھی رومال نچوڑ و گئا تو طوفان ہوگا اصفحہ ہستی
کی کیسی بولتی چالی تصویریں نظروں سے پنہاں ہوگئیں - خدایا وہ زمانہ
کے لوگ کیا ہوئے - ان واقعات کو سنکر جی چاہتا ہے - کہ کسی ایسے مقام
سنسان میں چلکر رہئے جہاں بقول استاد ع

ذرّہ و اختر زمین و آسمان کوئی نہ ہو

یہ وہی دنیا ہے یاد ہری میں اون حالات کا سننے والا ہوں - اوسپر
آنکھوں میں آنسو ہیں - میرے دوست حضرت تسلیم کے دل سے پوچھو خدا
جانے کیا حال ہوگا - اسوقت ہندوستان کے مشہور و معروف مستند
اوستادوں میں یہی ایک باقی ہیں جو اپنی آنکھوں سے بھری محفل کو
ناسخ و آتش کے درہم برہم ہو جاتے ہوئے دیکھ چکے ہیں صبح ہوگئی ہے
سینکڑوں شمعیں جل کر بجھ چکیں یہی ایک شمع آخر ہے جس سے یہ نشان
ملتا ہے کہ رات ایک محفل تھی اور وہی محفل تھی - اب کمیٹیوں کے جلسے
رہ گئے ہیں - حضرت اوستاد کا ایک مطلع یاد آتا ہے معلوم ہوتا ہے
کہ پرانی شاعری اور آجکل کے شعرا کی حالت دیکھ کر بزم سخن میں سخت گھبرا
گئے ہیں اور فرماتے ہیں کہ -

کیجئے ایسا جہاں پیدا جہاں کوئی نہ ہو
ذرّہ و اختر زمین و آسماں کوئی نہ ہو

اور گھبرانے کا سبب بھی مقطع میں موجود ہے - سنئے

تجہکو جیکا کریں تسلیم ایسی بزم میں جسمیں سب اوستاد ہوں اونکتہ داں کوئی نہ ہو

دوستو میرا شوق مجھے اسوقت ایک ایسی بزم میں لے گیا ہے -
جہاں نئی شاعری اور چہار چاند کے مضامین کے ذوق نہ تھے اور
گ ... کرنے والے بیٹھے ہیں - آپ سننے کے قریب ایک شمع ہے -

رہی ہے۔ دربار میں یہاں پہ ایک بیاض تیار ہو رہی ہے۔ وہ بھی دل میں چاک سی طرح محفوظ ہے۔ ہاں اس میں ایک مطلع ہے وہ سنا دیتے ہیں

حسرت انتظار خموشی سخن آرائی ہے
بے زبانی تو میری ہے وہی گویائی ہے

اسے سبحان اللہ کیا کہنا۔ رشک کی آگ میں جلنے والو شمع کی گفتگو سمجھ گئے نا۔

واجد علی شاہ بہادر خلد مکاں کے وقت میں ایک خاص وجہ سے آپ عہدہ داری سے برطرف ہو گئے۔ تین برس تک شبانہ روز بحرِ شاعری بیکاری میں اور کوئی شغل نہ رہا اپنی بحالی کے لئے بہت کوشش کی مگر کارگر نہ ہوئی۔ آخر متوکل ہو کر بیٹھ رہے۔ خدا نے بھی تکلیف پھر راحت دی۔ تحمل توکل میں پھل آئے اس کا مزا چکھ کر اب دربار شاہی میں آئے ہیں۔

دربارِ شاہی اور حالِ ملازمت بارِ دوم

نئے جلسے دیکھو۔ یہاں سبز مخمل میں منڈھی ہوئی کرسیاں اور بلور کا میز اور لیمپ نظر نہیں آتا۔ میری آنکھوں سے دیکھو قاقم و سنجاب و قالین کا فرش ہے۔ فرشی جھاڑ اور کنول روشن ہیں۔ ایک طرف تخت شاہی ہے۔ جس پر بادشاہ جلوہ افروز ہیں اور فرش پر بڑے بڑے ذی علم اور امیران قوم بیٹھے ہیں۔ محمد رضا خاں برق لکھنوی شاگرد رشید شیخ ناسخ استاد سلطان کو دیکھو اک بیاض کی غزل ہے۔ نظر اصلاح حاشیہ چڑھا رہے ہیں۔ شعر شاعری یا عیش و عشرت کا تذکرہ ہے۔ ہر فن کے ماہر فارغ البال نظر آ رہے ہیں اس بزم میں امانت وغیرہ بھی ہیں۔ بھلا یہ صحبت آپ حضرات کو کیونکر پسند آئے گی۔

اس بادشاہ اقلیم سخن کا جیسے اوستاد تسلیم کا قدرداں اور ہمہ پرور ہو کے اور کون ہوتا جب واجد علی شاہ خلد آشیان کا فیض عام مشہور جہاں ہوا اور اہل کمال کا مجمع ہوا تو اوستاد بھی کہ اقلیم نظم کے بادشاہ تھے بوساطت جناب کپتان مقبول الدولہ احسان الملک میرزا مہدی علیخاں بہادر ثابت جنگ قبول تخلص شاگرد رشید شیخ ناسخ کہ اوستاد کے بڑے دوست تھے۔ اپنے قدرداں سخن واجد علی شاہ تک پہنچے اور زمانہ کی ضرورتوں سے مجبور ہوکر اپنے استحقاق سوز دل کر کے اور خوشخط لکھ کے ایک عرضی پیش کی۔

اس سے فارسی کی استعداد ظاہر ہوتی ہے۔ میرے نوجوان دوستو۔ قبول کو جانتے ہو۔ بڑے ماہر فن اور بڑی عزت شخص تھے اوستاد اُن کے ملنے والوں میں ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ کہ امیر مرحوم اور داغ کم عمر اور زیر تعلیم ہوں گے۔ کیونکہ ان دونوں اہل کمال کے خطوط اور بیان نے یہ ظاہر کیا ہے کہ استاد تسلیم مدظلہ کے شاعری کی عمر ہم لوگوں کی عمر سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ بتاؤ میں انکی صحبتوں میں ہمعصری کے خیال سے ایسے کہنہ سال کو زبردستی کیونکر بٹھا دوں۔ زمانہ پانے سے کیا ہوتا ہے۔

عرضداشت آنحضرت ابو المنصور ناصر الدین سکندر جاہ فیض زمان محمد واجد علی شاہ خلد اللہ ملکہ

بعرض شہنشاہ عالی مکان | فلک آستان و ملک پاسبان
ہنرمند و ہم قدردان ہنر | چو خاقان و قیصر بہ گیتی سمر
بشان و بشوکت بعز و بجاہ | بماں تا قیامت چو خورشید و مہ
ز محنت کش تسلیم شوریدہ سر | ز دل می کشد نالہ نم اثر
بہ لطف و کرم ساعتے ہوشدار | بافسانۂ من دمے گوشدار
کہ از دست گردوں بجاں آمدم | ز بیچارگی در فغاں آمدم

چو یکدم بخت بطی گذشت
بعهدی که دولت رسیدی تو بود
ملک خلعت را بعهد عز و شان
بهمراه مهدی علی خان قبول
هم از خوشنویسی هم از شاعری
نفس شد گل نکهت بر آوردمے
حیاتم به عیش و طرب مے گذشت
که ناگاه این چرخ نامهربان
حسد برد بر عیش و آرام من
رضا را طمع کرد بر ملک و مال
نه آن باده ماند و نه آن جام ماند
چه ارباب جوهر چه ارباب جاه
بیک بادیه پائے غربت شدند
من از تیره بختی جدو دو فغان
چو نقش قدم خاک بر سر مدام
فلک را به این ضعف تاب و توان
کنون بر سرم آنکه جفای رود
بسے کردم اندیشه با جان خویش
بدرگاه آن شاه گردون وقار
بسا بگیے الم شادمانی کنم
بیابم چو غنچه بخود از نشاط
نویسم قصیده بعهد عز و جاه
به شیرین دگر تاب سنبل درهم
ولیکن چه سازم که بیمارگی
که در رشک شکل گوهر نماند

که آن طالع بام چو گل گذشت
چه با تحریر نقش هم نگین تو بود
همی خواند بر منبر آسمان
سرا بود اعلی ز خدمت حصول
توی داشتم جهان چاکری
گذشتے نه بے خنده چون گل دمے
به آرام و دل روز و شب میگذشت
دگرگونه شد در پے امتحان
بسنگ ریخت در باده جام من
فتاد اختر بکشود زر و بال
اگر شکوه بخت ناکام اند
به یکبار گشتند جمله تباه
بسے زاویه گیر تربت شدند
نه در خاک رفتم نه بر آسمان
به بیچارگی می کنم صبح و شام
هنوز است با من سر امتحان
که از باد بر نقش پای رود
کزین شهر بیرون کشم رخت خویش
کشم انتقام از غم روزگار
به پیرانه سر نوجوانی کنم
با فسردگی کم کنم ارتباط
بخوانم حضور شه هم کلاه
بگوش گل آواز بلبل دهم
رسیده است اکنون بدان پایگی
بتر دردمی او صورت زر نماند

ہمیں است بس ز عشاقِ وصال | کہ دارم وفائے تو در زبان
بود پائے پرکار تا در سفر | بود نقطہ تا محور مرکز مستقر
شود سے تو بادا بگردش مدام | محبت تو دارد با رام تام

نمک‌خوار سرکار عالی جناب
جگر خستہ تسلیم خانہ خراب

جناب سحر فیرانی کی باتیں نہیں بھولیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس عرضی میں جو کچھ اپنی بے سروسامانیوں کو تباہیوں اور جہاں دیدہ ہونے کا حال اقبوس کے پیرایہ میں لکھا ہے وہ کچھ اس طرح ادا کیا ہے کہ شیخ سعدی کی فصاحت یاد آجاتی ہے۔ جناب سحر نے حضرت تسلیم کے فارسی نظم پر مجھے بھی کہا کہ زبان اردو تو انکی زبان ہی ہے فارسی میں بھی وہ اوستاد ہیں۔ سعدی کی نے جو تھلکی حالت لکھی ہے وہ یہی رنگ ہے۔ جسکو میرے ناظرین دیکھ رہے ہیں گویا نخل فکر کی خوشنما پتوں پر لہلہاتی رنگت ہے اور وہ صفائی ہے اور اس میں گلاب کے دو چار پھول ہیں۔ وہ رنگینی ہے۔ ہاہا کیا خوشنما درخت ہے آنکھوں میں تراوت آگئی۔

اس عرضی کے ساتھ ہی ایک قصیدہ بھی نذر کیا تھا چنانچہ وہ اہل نظر کے ملاحظہ کے لئے درج کرتا ہوں۔
خاقانی اور عرفی کے کلام کا مزہ آتا ہے۔ بعض موقعوں پر صنعت غلو نے قصیدہ کو ستارے سے زیادہ روشن اور بلند کر دیا ہے۔ دوربین کی ضرورت نہیں نزدیک لگی ہوئی آنکھیں کافی ہیں ع

حاجت مشاطہ نیست روئے دل آرام را

قصیدہ

اسطرح نہ دل تڑپے رگ جاں کے برابر | ہر دم ہے دم خنجر برّاں کے برابر
ناکامی قسمت ہے کہ جھکتا ہے گردوں | ہر روز تمنا شب ہجراں کے برابر
تدبیر سحر شام کو ہوتی ہے دگرگوں | کیا کیا ہیں کرم گردش دوراں کے برابر
ادم میری تدبیر ہے تقدیر سے ایسی | جسطرح پشیماں ہو پشیماں کے برابر

روتا ہوں مصیبت کو کر رہتا ہے ہمیشہ
آرام مجھے میسر نہیں دم بھر نہ گردوں
الجھا ہے سر گشتہ نصیبی کہ شب و روز
کیا کیا نہیں خون گشتہ تمنا ہیں جگر میں
آنسو بھی خفا ہیں جو خفا تحت ہے مجھسے
دشوار ہے جنبش صفت نقش کف پا
کچھ منہ کو چھپائے ہوئے جاتی ہے عدم کو
عالم پہ میرے داغ ہو گلزار میں جا کر
تی نہیں دم بھر دل مایوس سے میرے
دو جگری سے نظر آتا ہے جہاں تار
پروانہ نہیں سوز جگر کی نہ عدو کو
ناقدری دوراں سے نہیں تاب کے قابل
لیکن مجھے اس پہ ہر وقت ہی تسکین
کہتا ہوں کوئی غم نہیں حامی ہے اگر شاہ
واجد علی آفاق میں کامل صفت ماہ
تا حشر میرا حوصلہ جیسے رہے برقرار
قوت وہ عاجز ہوا اگر اسکی حمایت
دانش میں فراست میں فلاطوں ہو کہ بقراط
مسطح بیاں ہو کہ کہتا کا فسانہ
افلاس کا لیتا نہیں دنیا میں کوئی نام
احسان و کرم میں کرم و فیض سے اسکی
حال غربا پر یہ ترحم ہے کہ جیسے
دلشاد رہا ہے ہمیشہ کہ شب و روز
یہ ذوق [illegible]
عالم میں بہادر کوئی ایسا نہیں آیا

گرداب میں گریہ کے گریباں کے برابر
چکر ہے مجھے گردش دوراں کے برابر
برباد ہوں میں گرد بیاباں کے برابر
سینہ ہے میرا گنج شہیداں کے برابر
تھک جاتے ہیں آکر میرے مژگاں کے برابر
گھر ضعف سے ہے گوشہ زنداں کے برابر
امید میری عمر گریزاں کے برابر
بیٹھوں جو کبھی میں گل خنداں کے برابر
حسرت ہے مجھے داغ عزیزاں کے برابر
ہے صبح وطن شام غریباں کے برابر
جلتا ہوں چراغ شب ہجراں کے برابر
ہر چند کہ ہوں ناظم سرواں کے برابر
ہر مشکل دشوار ہے آساں کے برابر
ہم مرتبہ شوکت میں سلیماں کے برابر
ہمتیل جہاں مہر درخشاں کے برابر
دارا کو جو سمجھو ہوں کسی درباں کے برابر
روباہ بھی ہو شیر نیستاں کے برابر
دونوں میں یہاں طفل دبستاں کے برابر
عالم میں گہر ریز ہے نیساں کے برابر
مفلس ہے غنی قیصر و خاقاں کے برابر
ہر مور کو دعوی ہے سلیماں کے برابر
بیکس ہو کوئی رحمت یزداں کے برابر
رہتی ہیں دعائیں لب خنداں کے برابر
چمکی نہ کبھی خرمن دہقاں کے برابر
دیکھی ہیں ورق دفتر دوراں کے برابر

قوت میں شجاعت میں فن تیغ زنی میں
رستم سے فزوں نام و نریمان کے برابر

پہنچے صف اعدا میں جو ہنگام وغا تیغ
دریا ہو رواں خون کا طوفان کے برابر

حاسد کو اگر چاہیے گفتار جراحت
تن پر سر ہو ہو سر پیکان کے برابر

کیا رتبہ شوکت ہے کہ پایا یہ عظمت
فغفور تو بیٹھے کبھی دربان کے برابر

کیا خاک لکھوں شعر مثل کی میں تو تعریف
رفعت میں ہر اک ذرہ ہے کیوان کے برابر

جنگل اثر کے سے جو اٹھے ہو تراید تک
پہنچے نہ کبھی قیصر ایوان کے برابر

ہر نقش پہ یک گل تر و تازہ و رنگیں
ہر صحن مکان گلشن رضوان کے برابر

کیونکر نہ مجھے فخر ہو تقدیر پہ اپنی
ثابت ہے کہ میں آج ہوں حسان کے برابر

گرد ہ مجھے شب و روز دل و جان و جگر سے
ہو وقف شہ قبلہ ایمان کے برابر

ہے یہ بھی وہ رتبہ کہ پڑھتا ہوں قصیدہ
سلطان اولی الامر جہانبان کے برابر

کیا حسن خداداد جو دیکھے تو عجب سے
کلمہ پڑھے ہر گبر مسلمان کے برابر

ہیبت دیکھی پیشانی و رخسار ہیں روشن
دن رات مہ و مہر درخشاں کے برابر

انسان و پری کیوں نہ کریں حلقہ بگوشی
فرمان ہے توقیع سلیمان کے برابر

خطبے میں پڑھا جائے اگر نام نہ اس کا
اسلام بھی ہو کیش کشیشان کے برابر

تسلیم کہا جنگ ہوس مدح سرائی
تا ناکہ رواں طبع ہے عمان کے برابر

ہنگام دعا ہاتھ سے دیتا نہیں اچھا
کہ جا کے در حضرت شہ مژدہ رساں کے برابر

جبتک مہ و خورشید الٰہی رہیں سیار
ہے نقش قدم عالم امکان کے برابر

جبتک جگر شمع فروزاں ہے الٰہی
داغ دل پروانہ سوزاں کے برابر

احباب شہنشاہ کی خاطر ہو جہاں میں
ہر شام رخ صبح درخشاں کے برابر

حاسد کو نہ دکھائے فلک دشمن آرام
ہر صبح سیہ شام غریبان کے برابر

دن بھر رہے پروانے کی مانند پریشاں
راتوں کو جلے شمع شبستاں کے برابر

واجد علی شاہ بہادر نے اس عرضی پر اور قصیدے کے صلے میں بہت کچھ انعام عطا فرما کر عزت کے ساتھ رخصت کیا۔ اور عرضی سابق الذکر شاہ نے اپنے قلم سے لکھا۔

بتقواے خوشنویس ولے خوشگو   ہر دو فن میں مشتاق و ہنرور و نکو
اسم تمہ مندرج بہ دفتر شد   بیست و پنج روپیہ مقرر شد

غرض وہی تیس روپیہ ماہوار جو پنشن میں ملتے تھے ابتدا سے جب تک بادشاہ سے تا انتزاع سلطنت آپکو ملتے رہے تنخواہ لانے کے لئے آپکو جانا بھی نہیں پڑتا تھا۔ گھر بیٹھے آپکے بڑے بھائی منشی عبداللطیف صاحب مرحوم کہ ملازم منشی خانہ شاہی میں تھے پہنچا دیتے تھے چنانچہ عرصہ تک آپ نے آرام سے زندگی بسر کی۔ مگر زمانہ غدر کا جب سامان ہوا تو آپ پھر او شد ار مقرر کر دئے گئے اور کلام انجام دیکر تیس روپیہ ماہوار خزانہ شاہی سے لیتے رہے۔

غدر کا اثر

اے لکھنو ترے۔ قصر میں جنکے ہزاروں جھاڑ ڈکنول جلتے تھے اُنکی تربت پر بھی اب جلتا نہیں شب بھر چراغ قاقم و سنجاب اور مخمل کے فرش پر بیٹھنے والے پاؤں پھیلائے خاک میں رو رہے ہیں۔ اُنکے وہ بڑے بڑے محل جہاں اہل علم و اہل ہنر بیٹھتے تھے آج وہاں ایسا ہیل نظر آتے ہیں جن کے در پر ہاتھی کھڑے ہوتے تھے وہاں کتے بھونکتے ہیں۔ وہ بیگمات و مخدرات عظمت سمات جنکے جسم میں چادر گل گڑتی تھی۔ آج اندھیری تنگ کوٹھریوں میں سخت زمین پہ تڑپتی ہیں۔ میرے احباب نے یہ مطلع سنا ہوگا کہ

بر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

وہ باغ جہاں سوائے پھول پھل کے کہیں سبزہ بیگانہ تک نہ تھا آج کانٹے سے بھی زیادہ خشک ہے۔ ہر طرف خاک اُڑ رہی ہے۔ سلطنت لٹ گئی۔ اہل علم دانے دانے کے محتاج ہو گئے۔ دنیا منقلب ہو گئی حضرت استاد کے متعلقین بعض آبادی سے چلے آئے۔ صرف آپکے بڑے بھائی لکھنو میں تھے حضرت ... بھی لکھنو چلے آتے تھے مگر افسوس اسی زمانہ میں

نواب کلب علی خاں والی رامپور ولی عہد تھے نوکری کر لی تھی

حال ملازمت بار سوم

نیرنگ دنیا کو دیکھ کر تارک دنیا ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔ جس چمن کو فصل بہار میں شگفتہ پایا۔ جہاں گلاب اور ہر طرح کے پھول کھلے تھے۔ خزاں میں اُسے دیکھ کر بے اختیار رونا پڑا۔ نہ وہ پھول نہ وہ پھل نہ وہ قمری نہ وہ بلبل۔ جس محفل میں شام کو ساقی اور ستار مئی اور ولدار یار غمگسار بیٹھتے تھے اُسی کو صبح کو دیکھا تو گورستان کا عالم یاد آگیا۔ نہ وہ لوگ نہ وہ باتیں مختصر یہ کہ ہر شے میں انقلاب ہے العالم متغیر وکل متغیر حادث۔ انسان کی ہستی کو دیکھے کبھی ایک بچہ تھا۔ کبھی جوان تھا۔ کبھی پیر ناتوان تھا۔ اب تو اب خاک میں جا کر سو رہا چار دن تو عزیز و اقربا قبر پر شمع بھی جلا گئے اب ان کا بھی پتا نہیں خدا جانے انکو کس کی نظر کھا گئی۔ لوح مزار بھی نہیں جو یہ ظاہر ہو کہ یہ فلاں شخص کی قبر ہے افسوس۔

زمانہ غدر میں حضرت اوستاد مدظلہ بھی نہایت پریشان رہے۔ رامپور میں کلب علیخاں بہادر سے ملے اور قصیدہ نذر کیا۔ سلام کرنے کو بار بار جاتے رہے مگر وہ اس وقت میں ولی عہد تھے قلیل و کثیر کچھ مقرر نہ ہوا آخر زمانہ پر آشوب میں اوقات بسری کا یہ ذریعہ ہاتھ آیا کہ ایک بیگم کے لڑکے کو پڑھانے کی نوکری کی۔ پچیس روپیہ ماہوار اور کھانا ملتا تھا۔ دس بارہ مہینے اسی نوکری میں بسر کئے یہ وہ زمانہ تھا کہ بڑے بڑے ذی دول اور اہل کمال خدمتگاری کی تلاش کرتے تھے ورنہیں ملتی تھی۔ شہزادے بھیک مانگتے تھے اور محروم رہ جاتے تھے۔ دس دس گیارہ مہینے تک ڈاک اور رستے کا انتظام چونکہ صاف نہ تھا اس لئے حضرت تسلیم مدظلہ تڑپ تڑپ کر رہتے تھے آپ وہ وطن تھا جسے لوگوں نے چھوڑ دیا تھا۔ کسی کی کسی کو خبر نہ تھی کہ کون زندہ ہے موجود کہاں ہے اوسی زمانہ میں آپ کا قدیم دیوان بھی ہمراہ اثاثہ بیت کے لٹ گیا زمانے یہ اوسی لکھنو کا ذکر ہے جسے تمھیں تاریخ نے یوں نظم کیا

بخوشے آسمان کی کیا ہے طاقت جو چھوڑا تجھے لکھنو۔ لکھنؤ ہم پر فدا ہے ہم فدائے لکھنو آخر تھوڑے دنوں کے بعد رستہ صاف ہوگیا تو آپ پھر نواب کلب علیخاں بہادر سے ملے اور کہا گھروالوں کا حال معلوم نہیں دس گیارہ مہینے ہو گئے اب کوئی خطرہ باقی نہیں سرکار انگریزی نے بخوبی انتظام کرلیا رستہ بالکل صاف ہوگیا۔ میں لکھنو جاتا ہوں (ا سئے یہاں پہلے اختیار ایک مطلع مولوی اولاد علی کا ہش مرحوم جونپوری متیم کیا تلمیذ رشید مصحفی و اوستاد بیادر آتش مرحوم کا یاد آیا۔ میرے دوستو یہ ایک بڑا باکمال اوستاد گذرا ہے اپنا بہت کچھ نام چھوڑا مگر اہل گیا لے کہ مذاق سخن سے بے بہرہ تھے اور وہ زمانہ غدر کا تھا انکے کلام کی حفاظت اور قدر نہ کی۔ اور آج بھی بفضلہ یہاں کے حضرات اس ماہر فن کے کلام کو کوئی چیز ہی نہیں سمجھتے۔ یہ تقاضائے انصاف ہے۔ ہاں وہ مطلع سن لو)

قفس میں جو تڑپا چمن یاد آیا ۔ مصیبت زدوں کو وطن یاد آیا

نواب صاحب نے فرمایا کہ ہاں اب کوئی خطرہ نہیں ہے بہتر کل ہم سے ملئے۔ چنانچہ آپ تشریف لے گئے نواب صاحب نے کہ ملے تھے سو روپیہ زادراہ دیکر رخصت کیا۔ آپ فرخ آباد اور کانپور ہوتے ہوئے لکھنو تشریف لائے اپنے بڑے بھائی منشی عبداللطیف صاحب مرحوم سے ملے۔ وہ بہت گریہ وزاری سے گلے لپٹ کر روتے رہے۔ اور آپکا بیان ہے کہ دو چار جوتے کپڑے کے عمدہ بنوادئے اور پچاس روپیہ نقد دیکر وطن قدیم جہاں آپکی والدہ نہیں بیٹھے فیض آباد روانہ کیا خدا ہر تیری کہتے ہوں کو گلانوں سے پوچھتیں لاتے اوستاد کا بیان ہے کہ اس وقت میرے پاس دو سو روپیہ تھے والدہ زندہ تھیں مجھکو دیکھ کر نہایت درجہ خوش ہوئیں دعا سے ماں کی محبت عجیب محبت ہے ہم اور جاتا کہ گویا مردہ قبر سے اٹھ کر آیا ہے۔ آج رت جگا ہوتا ہے کل شہید کی نظر پر چادر چڑھتی ہے۔ عزیز و قریب جو ار

کے دیکھنے کو آنے لگے غرض یکدو مہینے میں وہ سب دو پیہ اپنی والدہ کے یونہیں صرف کر ڈالے۔

جب نوکری کی ضرورت پیش آئی تو آپ لکھنو تشریف لائے ہر چند وہ لکھنو نہ تھا مگر پھر بھی زمین کی تاثیر باقی تھی ہر چند ہوا نا موافق تھی مگر وہاں کی زمین اپنی قوت سے وہ خوش رنگ پھول کھلایا کرتی ہے کہ خواہ مخواہ اہل نظر اوسی طرف سیر کرتے تھے۔ اور اوس وقت میں چونکہ اگلے نوابوں کے یادگار کچھ موجود تھے اس لئے دہلی کے اہل کمال یہی چلے آتے تھے۔ مرحوم دلی خدا تجھے بجوار رحمت میں جگہ دے۔ افسوس وہ عالی نسب لوگ ہیں بے جان عورتوں کی طرح دل کا حوصلہ آنکھوں سے دیکھ کر نکال لیتے تھے۔ اب تو ویسے صورتیں بہت ڈھونڈ ہنے سے نظر آتی ہیں۔ ہائے غالب

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

حال ملازمت بار چہارم

یہ وہ زمانہ ہے کہ لکھنو میں منشی نول کشور نے اپنا نیا چھاپہ خانہ کیا تھا۔ چنانچہ جب آپ لکھنو تشریف لائے تو منشی جی نے ہمدردی کی اوسی مطبع میں بیس روپیہ ماہوار کے منشی مقرر ہوئے۔ اس کے علاوہ نواب محمد تقی خاں بہادر خلد آشیان کہ سات سو ستاون روپیہ ماہوار کے وثیقہ دار تھے اور حضرت نسیم دہلوی کے شاگرد تھے بعد انتقال حضرت نسیم کے آپ کی شاگردی کا فخر حاصل کیا وہ آپ کے بڑے سرپرست اور قدر دان تھے۔ حضرت تسلیم مدظلہ کا بیان ہے کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو میں رامپور نہ آتا نواب محمد تقی خان بہادر یوں تو بہت کچھ سلوک اچھے اوستادیعنی حضرت تسلیم کے ساتھ کرتے تھے مگر ظاہر طور پر آپکو دس روپیہ ماہوار بھی دیتے تھے مرض الموت میں نواب صاحب نے کہا کہ چاہئے ہیں بیس روپیہ ماہوار اپنے وثیقے سے آپکے نام لکھ دوں۔ میرے بعد ہمیشہ وقتاً آپ کو نہ

پہنچ نہیں سکے۔ مگر چونکہ یہ کلمہ عالم پاس میں نواب نے کہا تھا۔ حضرت تسلیم نے بمشکل سے گوارا نہ کیا۔ اور اوستاد نے فرمایا کہ خدا وہ دن نہ کرے کہ حضور ہوں اور میں وظیفہ کی تنخواہ کھاؤں ایسے اہل شاگرد اب چراغ آفتاب لیکر بھی کوئی ڈھونڈھے تو مل نہیں سکتے۔

اے سبحان اللہ۔ اگلے بزرگوں کے خیالات کسقدر پاکیزہ اور صاف تھے۔ یا ہے وہ لوگ کیا ہوئے۔ بھلا آج کوئی رئیس کسی کو کچھ عطا کرنے کو کہے تو وہ بغیر عدالت رجسٹری تک پہنچائے کب مان سکتا ہے۔

حق تو یوں ہے کہ ان رہے سہے چند کہنہ سال لوگوں کے بعد دنیا میں ایسی باتوں کا مذکور ہی نہ ہوگا۔

اوسی زمانہ میں آخر انقلاب نے وہ دن دکھایا کہ سنہ ۱۲۸۲ھ میں پہلے حضرت نسیم دہلوی راہی ملک بقا ہوئے۔ اور حضرت اوستاد نے یہ تاریخ وفات کہی

کیا کہوں سوختہ جانی تسلیم — داغ ہے سوز نہانی ہئے ہئے
اوٹھ گئے گلشن فانی سے نسیم — رشک قدسی و فغانی ہے ہے
ہر طرف سے یہی آتی ہے صدا — موجد شعلہ بیانی ہے ہے
منھ سے نکلی دم شیون تاریخ — ناظم ملک معانی ہے ہے

۱۲۸۲ھ

اس کے بعد حضرت تسلیم مدظلہ نے اپنے اوستاد نسیم دہلوی کا کلام بلاغت نظام کہ بے نظیر ہے مرتب فرمایا اور نواب محمد تقی خاں کی سرپرستی اور سعادت سے وہ دیوان سنہ ۱۲۸۵ھ میں چھپوایا۔ اسکے بعد آں قدح بشکست وآں ساقی نماند۔ خود نواب صاحب راہی ملک بقا ہوئے۔ اور اوستاد کو شمع سان روتا ہوا چھوڑ گئے۔ اب جو اہل کمال رہ گئے تھے انہیں اپنے کلام کے چھپوانے کا اور ترک سخن کا خیال پیدا ہوا کیونکہ اپنا یادگار چھوڑنا ضرور تھا اوس وقت میں اہل علم و ماہران فن کے بڑے قدردان منشی نول کشور صاحب موجود تھے انہوں نے حضرت اوستاد مدظلہ کا کلیات اپنے مطبع میں سنہ ۱۲۸۹ھ میں چھاپا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اوستاد حال میں آپ کے ہمعصر جناب آغا علی شمس

اور میرزا غلام محمد خاں تپش وغیرہ موجود تھے۔ جناب شمس اوستاد سے بڑی دوستی تھی چنانچہ زہرہ و مشتری کے نام کا ایک سفارشی خط حضرت اوستاد مدظلہ کا نوشتہ انکے کلیات میں موجود ہے۔ یہ دونوں لکھنوکی نامی طوائف اور شاعرہ ہیں شمس مرحوم کی شاگرد ہیں۔ اوس زمانہ میں ان لوگوں میں کچھ شکر رنجی تھی۔

نواب محمد تقی خاں بہادر کے مشاعرے اور قابل افسوس باتیں

میرے ایک روشناس نے میر کلو عرش کی بیجا تعریفیں بہت کیں جس سے حق تو یوں ہے کہ کان بے مزہ ہو گئے مجھے شبہ ہوا۔ اور حضرت اوستاد سے پوچھا کہ آپ نے میر کلو عرش کو دیکھا ہے اوستاد نے جو کچھ فرمایا وہ بعینہ لکھتا ہوں (میر کلو عرش اپنے کو میر کا بیٹا کہتے تھے واللہ اعلم کبھی مشاعرے میں طرح کی غزل پڑھتے نہیں دیکھا۔ میرے شاگرد نواب محمد تقی خاں بہادر کے مکان پر مدتوں مشاعرے ہوئے۔ میر کلو عرش بھی آتے تھے میں نے انکو اپنے زمانہ کہولیت میں دیکھا تھا۔ گندہ رنگ تھے افیون چڑھ گئی تھی اور افلاس انپر طاری تھا۔ بزرگ صفت مشاعرہ کے وقت نواب صاحب کچھ نقدی سے خدمت کرتے تھے اور بس طرح کی غزل پڑھتے نہیں دیکھا) اس کا مطلب میرے روشناس یادگار میر سمجھے گئے ہونگے۔

مصنف آبحیات کی تحریر سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ چراغ کے نیچے اندھیرے کا مصداق تھا حیرت ہے کہ شاد لکھنوی مرحوم انکے شاگرد کیونکر تھے۔

اوستاد مدظلہ فرماتے ہیں کہ آتش مرحوم کے مرنے کے بعد لکھنو میں یہی ایک جگہ تھی جہاں اہل کمال برابر تشریف لایا کرتے تھے اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ نواب محمد تقی خاں صحبت یافتہ رئیس اور زمرہ اہل کمال میں داخل تھے۔ انکا کلام دیکھنے ہی کے قابل ہوگا۔

حضرت اوستاد فرماتے ہیں کہ میرے اوستاد کے یادگار شاگرد اول جناب منشی اشرف علی
صاحب اشرف لکھنوی ایک عجیب قسمت کے شخص سال ... اشرف آباد میں موجود
ہیں جو اوستاد نے انکا نام اپنے دیوان میں بار بار تحریر کیا ہے اور انکی عمر اوراز
اسوقت سے ظاہر ہے کہ اس شیدائی نے خدا انکی کتنی تعلیم کیا ہے جنکے ہنر چھوڑے ہیں
اگر انکا کلام جمع کیا جاتا تو دو تین دیوان ہوتے ... کہ خوش ... سمجھتے
حرمن ... ایک ... نذر ناظرین کرتا ہے۔ اشرف لکھنوی

عروج کیلی تو تھے جب بیکل ہوئی ۔ یوں شب فرقت کی مشکل حل ہوئی
دیکھی حسرت رہی دل ہی میں میرے ۔ تیغ ابرو سے نظر گھایل ہوئی

لکھنؤ کے مشہور شاعر جناب امیر لکھنوی نے مجھ سے ملاقات میں فرمایا تھا کہ
جناب اشرف لکھنوی بھی اوستاد مستند ہیں۔ آپکی تصنیف سے مصطلحات
زبان اردو ... محاورات کا جامع ۔ نسخہ ایک نادر کتاب ہے۔
اور مستند کے اعتبار سے لاجواب ہے۔ اوستاد کے سینکڑوں شعر اس میں
سند کے طور سے داخل کئے گئے ہیں

غرض نسیم دہلوی کی یادگار حضرت تسلیم لکھنوی اور اشرف لکھنوی مختصر
ہندوستان مشہور و معروف اوستادوں میں باقی ہیں خدا سلامت رکھے
افسوس کہ حضرت نسیم دہلوی کی سوانح عمری کسی نے کامل طور پر نہیں لکھی
دیکھنے کے قابل ہوتی کیونکہ نواب اصغر علیخان نسیم دہلوی کا پایہ بہت بلند
ہے۔ اور انہیں کے وقت میں شاعری کا باغ شاداب اور تازہ تھا

اوستاد نے عالم یاس میں فرمایا تھا کہ حضرت نسیم و مومن دونوں کے
لڑکے تھے مگر اب مجھکو نہیں معلوم کہ زندہ ہیں یا نہیں۔ نسیم دہلوی کا ایک
لڑکا محمد اسمعیل نام عرف ... مرزا اپنی بہن کو لیکر حج کو گیا وہ واپس نہیں
آیا۔ ایسے گئے کہ لوگ نام و نشان دیکھ کر بھی بے نشان ہو گئے۔ افسوس کہ
نواب محمد تقی خان بہادر چل بسے اور نسیم دہلوی کے سلسلے کا شاعرہ اپنے
ساتھ لیگئے ... گویا

شمع کے گل ہوتے ہی پروانے راہی ہو گئے ۔ دفعتاً گیا تھا میان انجمن کیا ہو گیا

حال ملازمت بار پنجم

جب تک یہ ایسا قدردان اہل کمال نہ رہا اور کلب علیخاں بہادر والی رامپور مسند نشین ہوئے شعر و شاعری کا چرچا ہوا۔ تو انہوں نے حضرت امیر اللہ تسلیم کو لکھنؤ سے بلاکر شاعروں میں تیس روپیہ ماہوار پر نوکر رکھا حضوری میں رہنے لگے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ قلق۔ امیر۔ بحر۔ منیر وغیرہ موجود تھے۔ دو برس کے بعد عدالت فوجداری میں ناظر کیا۔ پھر تحصیلدار کیا بعد ازاں آپ محکمہ صدر میں ناظر ہوئے پچاس روپیہ ملنے لگے۔ پھر مدرس فارسی ہوئے۔ پھر ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوئے۔ اب سرکار رامپور سے بطور پنشن بیس روپیہ ماہوار ملتے ہیں۔ گو کچھ کام کرنا نہیں پڑتا ہے مگر سرکاری کتب خانہ میں حاضری ضرور ہے۔ لکھنؤ کی آمدورفت بوجہ صاحبزادہ منشی ... صاحب اور احباب کے اب تک برابر جاری ہے۔ شاعروں کی شرکت امیر۔ منیر وغیرہ کے بعد امیر و داغ و جلال کے وقت میں بطور نمائش کبھی کبھی امراء سے تشریف لے بھی جاتے تھے۔ تو لوگوں کی غزلیں سنکر چلے آتے تھے کبھی کچھ شعر پڑھ دیتے تھے مگر گویا ترک سخن کر چکے ہیں دربار کی آمدورفت بھی قریب قریب بند ہے عید وغیرہ میں بھی قصیدہ لیکر نہیں جاتے فہرست نذر میں آپکا نام ہوتا ہے صرف دستخط کر دیتے ہیں اصل بات یہ ہے کہ نواب حامد علیخاں بہادر خلد اللہ ملکہ والی رامپور کو وہ شوق سخن نہیں

والی منگرول آپکے بہت بڑے قدردان ہیں (والی منگرول نے ایک زمانہ میں اہل کمال کی بہت قدردانی شروع کی۔ ہر چند خود شاعر نہیں ہیں مگر پھر بھی ادھر ادھر کے شعرا نے آمدورفت شروع کی قصیدہ پر قصیدہ گذرنے لگا۔ [illegible] سخاوت نے ریاست کو قرضدار کر دیا اب چیدہ لوگوں کی آمدورفت باقی ہیں حضرت شاد لکھنوی کے بھی بہت ہی قدردان ہیں اور اکثر یاد فرماتے ہیں) ایک برس آپ منگرول بھی تشریف لے گئے تھے وہاں جاکر جو آپ نے مجھے سرفراز نامہ لکھا تھا وہ یہ ہے

تو ایسا صاحب بلحاظ بہ نظر قدردانی و عزت افزائی چھتا ہے کہ
یہاں رہیے پچاس روپیہ ماہوار اور جو خرچ کہ ہوگا دونگا۔ کسی طرح کی
تکلیف نہ ہوگی میں نے ہاں نہیں کچھ نہیں کہا۔ اور نہ میرا ارادہ ہے کہ یہاں
رہوں۔ لوگ کیا کہیں گے میرے دوستو آپ نے اسکا مطلب سمجھا۔
یعنی رامپور والوں کا یہ طعن ہوگا کہ آخر وقت میں انہوں نے ریاست کا
کچھ خیال نہ کیا اور پچیس روپیہ کو کم جانا) دوسرے یہاں کی آب و ہوا
بھی بسبب بحر و نزدیک ہونے سمندر کے بہت خراب ہے۔ اور خلقت
غیر مانوس نہ میں اُنکی زبان سمجھتا ہوں نہ وہ میری۔

واقعی ان حالتوں میں آپ کس طرح تشریف رکھتے ترک کا خیال کیا
اور اوسی پنشن کو غنیمت جانکر واپس آئے۔ مگر بطور پنشن ریاست منگرول
سے بھی کچھ ضرور ملتا ہے کیونکہ ایک بار لکھا تھا کہ میری چودہ مہینے کی تنخواہ
چاہئے نہ اونہوں نے عنایت فرمائی نہ میں نے طلب کی اور بسبب ترک
سفر کے کوئی قصیدہ بھی نہیں بھیجا والئی منگرول کے میر منشی محمد اصغر علیخاں
صاحب رامپور کے رہنے والے ہیں ابھی آئے تھے مجھے ملے تھے میں
نے اون سے بھی اپنی تنخواہ کی بابت کچھ ذکر نہیں کیا۔ پندرہ روپیہ ماہوار
اس ریاست سے بھی ملتے ہیں۔

حال عمر

آپکی عمر الہم زندہ قریب سو برس کے ہے۔ آپ نے خود بھی ارشاد
فرمایا اور ظاہر بھی یہی ہوتا ہے نوّے سال سے آپکی عمر متجاوز ہے۔

آخری سفر

جب رامپور میں چند لوگوں کی برطرفی کی خبر مشہور ہوئی۔ تو پہلے امیر
لکھنوی نے رامپور چھوڑا بھوپال ہوتے ہوئے فکر معاش میں دکن گئے۔
اور وہاں کی خاک پر پاؤں پھیلا کے سوئے ہے۔ اس پر ادران کی ناکا،

پہلی حضرت شدہ کیا بیاب تھے ہے دل سے یقین ہے
یادگار دلّی ہے۔ دیکھو یہ مقام شاعروں ہیں دلّی ہی کے لیئے مبارک ہوا کیونکہ
اسقدر قدردانی ایسی کی گئی جا نکی استاد ذوق مرحوم کی بھی نہیں ہوئی
ہرچند وہ دلّی کی گلیوں پر دکن کو صدقہ کرتے تھے۔ مگر وہی دکن اسوقت
اس مرحوم کے نام کو شاگرد کے نام سے تمام عالم میں روشن کر رہا ہے بلکہ
الصیرہ دہلوی اوستاد ذوق مرحوم بھی یہی گوشہ گیر تھے پھر حضرت اوستاد
نے قدم استقلال کو جنبش دی سیدھے ٹونک گئے وہاں آپکے ایک
بڑے سعادتمند شاگرد وزیر محمد خان محتاج آپکے قدردان تھے۔ جب آپ
وہاں پہنچے معلوم ہوا کہ وہ توکل فرما گئے۔ اب کہاں جاتے ہنگرول
ہوتے ہوئے رامپور چلے آئے۔ نواب کو خدا نے فرزند تاجدار عطا کیا تھا
اس خوشی میں پرطرفی رہ گئی آپ بھی رہ گئے۔ ہرچند کہ امیر کے انتقال
کے بعد آپکے معزز احباب نے آپکو دکن کی طرف جانے کی رائے دی مگر
آپ نہ گئے بلکہ حال ہی الحال۔ چمن کچھ اور کہتی ہے۔ وطن کچھ اور کہتی ہے
والی طرح میں آپ نے ایک آہ سرد کھینچکر یہ مطلع پڑھا کہ
میرے دل میں تمنائے دکن کچھ اور کہتی ہے ۔ مگر یاد امیر بے وطن کچھ اور کہتی ہے
اس سے صبر و قناعت کی بو آتی ہے۔

شاگردوں کا مختصر حال

یہ وہ معاملہ ہے جسکے بارہ میں زبان قلم کی طاقت گفتار زائل ہوئی جاتی
ہے میں نے چند قلمی عریضے بھیجے مگر حضرت اوستاد نے یہاں یہی کہا کہ
شاگردی اوستادی کیسی شاعران نو دکن کا دلال ہوں اگر ایسا اصرار ہے جو
اکثر لوگوں کا نام آپ نے فرمایا۔ بالکل صحیح ہے۔ اونکا نام نامی درج تذکرہ کرتا
ہوں اور اونکے بارہ میں متفقات رائے بھی ظاہر کرتا ہوں)
مرحوم نوروز علی خان رشید الکھنوی۔ اوستاد نے انکا نام جن تعریفوں
کے مستحق ہونے کے لایق لکھا وہ مجھے انکی حالتوں کے لکھنے کو مجبور کرتا ہے

... تہ ہے کہ یہ ہر طرح ہماری بزم سخن کا گلدستہ تھا افسوس [illegible]
نے اسکو ختم کر دیا۔ ایک زمانہ میں اخبار طوطی ہند میرٹھ ۱۸۸۰ع سے
ایک گلدستہ بھی جاری ہوا تھا جو جن لکھتے تھے یہ طوطی ہند کا ضمیمہ اور ظریفانہ ارتھا۔
بہت کچھ نظم و نثر لکھا اور یا اکثر استاد امیر سے اصلاح لی۔ مگر وہ رہنے
والے لوگوں کے خیالات چونکہ منشی سجاد حسین مہتمم اودھ پنچ اور استاد
کی ملاقات تھی اس لئے استاد نے مجبوری ظاہر کی۔ کلیات منیر لکھنوی
میں جہاں امیر مد ظلہ آج تک کی تاریخیں اعداد امیر وغیرہ کی بطور تقریظ نظمیں
موجود ہیں وہاں اس باکمال کی بھی تقریظ ہے اور جن لفظوں میں آنکا نام
منیر مرحوم نے لکھا ہے اوس سے انکی حالت ظاہر ہوسکتی ہے۔ معلوم
نہیں دیوان انکا چھپا ہے یا نہیں۔

منشی سید احمد وفا رامپوری۔ جناب وفا کا کلام ایسا پاکیزہ اور استاد
کے رنگ میں ہے کہ مجھے انکا نام دوسرے نمبر میں لکھنا ہی پڑا کیونکہ جو
صحبت میں ہمراہ رہتے ہیں۔ استاد کے کلام کا سایہ پڑ گیا ہے شرف
حضوری اسقدر کسی کو نصیب ہے۔ وفا کے پاس دو چار دیہات سرکاری
بطور مستاجری کے ہیں اور کھنڈسار جس میں شکر بنتی ہے یہ بھی ہے دس
پانچ آدمی نوکر ہیں۔ وفا کی وفاداری کی جو کچھ تعریف کروں بجا ہے استاد
گذشتہ سال میں عارضہ ہیضہ میں مبتلا ہوئے۔ رامپور میں کوئی نہ تھا
یہ اپنے مکان پہلو اٹھا لے آئے اور بہت خدمت کی خدا کے فضل سے
اچھے ہوگئے۔ پھر بھی استاد کو جدا کرنا گوارا نہ کیا اپنے مکان میں رکھکر
مطابق بہت خورد و نوش کا سامان کرنا چاہا مگر استاد کو کب یہ منظور تھا آپ
نے فرمایا کہ باوجود تو بہت [illegible] غیرت نہیں قبول کرتی کہ دوسرے کی
روٹی پر پڑوں چنانچہ کچھ نقد طے پا گیا وہ مجبوری لے لیتے ہیں۔ خدا
ایسے استاد پرست کو ترقی دے۔

منشی اعزاز الدین صاحب اعزاز مہتمم گلدستہ صداے حامدی۔
آپ نعت گو ہیں۔ کلام سنجیدہ ہے مانگی اور حفیظ کی غزلیں استادانہ [illegible]

بھی بہت اچھی صحبتیں یاد گار ہیں۔

سید عطا کریم صاحب عطا بہاری۔ آپ بہت مضمون رس ہیں۔ میرا انکا ساتھ کیا کے دو ایک مشاعروں میں ہوا ہے۔ فصل شاعر نہیں ہے۔ مگر وہ ہمیشہ کچھ کہہ لیتے ہیں۔ اوستاد نے اکثر تذکرہ کی غزلوں کے اصلاح کا مجھ سے کیا ہے۔ بڑے صاف باطن شخص ہیں۔

مولوی ظہیر احسن شوق نیموی آپ کا نام اخباری دنیا میں تحقیق اور جلال اور آزاد سے جھگڑنے کے باعث روشن تھا مگر اب انہوں نے گویا ترک سخن کیا صاحب دیوان ہیں۔ مجھ سے ملاقات بھی ہے۔ اور مشاعرہ میں میرا انکا ساتھ رہا ہے۔ اب داغ کی تقلید کرتے ہیں صاف شاعری آپکو پسند ہے۔ ذی علم ہیں۔ حضرت اوستاذی الشعراء شمشاد فرنگی محلی لکھنوی کے بھی شاگرد ہیں زیادہ تر لوگ انہیں شمشاد ہی کا شاگرد جانتے ہیں۔ عظیم آباد میں لیا جشتر تھے ہیں۔

مولوی نظیر حسین فریاد۔ آپ بھی صاحب دیوان ہیں کلام اچھا شگفتہ ہے۔ طبیب ہیں۔ آپ صوبہ بہار میں تشریف رکھتے ہیں۔

انکے علاوہ منشی گور پرشاد قیس اور بہتیرے لوگ ہیں جنکا نام معلوم نہیں۔ مدراس اور رامپور میں سینکڑوں شاگرد ہیں۔ کیا کروں میں نے تو چند بار اوستاد سے پوچھا آپ نے بتایا نہیں۔ ایک بار اوستاد نے سرفراز نامہ میں لکھا تھا کہ میں اس قابل نہیں ہوں جو کسی کو اپنا شاگرد کہوں آپ لوگوں کی شرافت ہے جو مجھے اپنا اوستاد فرماتے ہیں۔ کیا کہوں کبھی کبھی کے کہنے والے مشاعرے کے شوقین بہتیرے ہیں ویسی ہی انکی غزل بھی دیکھ دیتا ہوں کبھی مجھے یہ بھی نہیں پوچھتے کہ تصرف کیوں کیا لکھنو میں جو لوگ تھے مر گئے۔ اب امیر مرحوم کے اکثر شاگردوں نے اور رامپور کے اکثر نوشقوں نے دق کر رکھا ہے۔ ترک سخن تذکرہ کی تیاری کیا کروں۔ ہاں آپکے اطراف میں سید عطا کریم عطا اور نظیر حسین صاحب فریاد بہار میں خوشگو ہیں

اور پٹنہ میں حقوق ہیں۔ اور گیا میں بجز تمہارے اور کوئی نہیں۔

اور ہاں میں بھول گیا۔ ایک بار آپ نے برامپور والے سید جعفر علی قادر کا نام لیا تھا کہ یہ بھی مجھے اپنا کلام دکھاتے تھے اب دیوان کی تکمیل کے واسطے ملک سخن کیا گیا کہ اکثر حضرات نے میری مراسلت سے اوستاد کے پاس اصلاح کی درخواست کی آپنے صاف لکھا کہ اور لوگ موجود ہیں۔ اسے ذوق کہنے کو چشم حقارت سے دیکھئے۔ سب کہتے ہیں بیغرض لوگ کی ہم سخن نہیں۔

اخباری دنیا میں بسر کرنے والا عرش بھی اپنے کو پانچوں سواروں میں داخل کر بلیو یادگار سلطہ دہر کچھ اپنا حال رقم کرتا ہے کہ ہیچمدان کو شاگردی پر فخر نہیں صرف غلامی بہ مدت سے فخر ہے۔ صاحب دیوان ہوں مگر کلام ناپسند طبع ہے۔ عربی فارسی کی کتابیں عالم باعمل مولانا محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ اور مولوی عبدالکریم صاحب سے پڑھی ہیں مگر وہ کچھ نہیں۔ چند کتابیں اپنی تصنیف سے لیکن تحریر میں ہیں مگر وہ کیڑوں کے نذر کے لئے الماری میں بند کردیں کیا کروں فصل نکل گئی۔ مضمون کے شعر پسند کرتا ہوں مگر نئی روشنی والے بگڑتے ہیں۔ سوپشت سے تعلقہ داری بھی ہے۔ مگر والد مرحوم یعنی جناب منشی بندہ علی صاحب وکیل و رئیس شہر گیا مغفور کے وقت کا تین چار لاکھ روپیہ قرض ہو گیا و حاقت باقی ہے۔ اوستاد کے آخری وقت میں اونکی شہرت کو مرتا ہوں۔ اوسپر یکی کوئی اوستاد بھائی ساتھ نہیں دیتا اپنی مشق کے بارے میں کیا لکھوں عمر گذر گئی مگر ہنوز روز اول ہے۔ سب شاگردوں میں خدا نے مجھی کو بد نام کنندہ نکونامے بنایا ہے۔ جو دل میں پیدا ہوا حتی المقدور اساتذہ کی جوتیوں میں رہ کر زبان کی درستی کی کوشش کی۔ مگر آپ دو ایک زیادہ کیا ہی میں رکہا اور اسیکو وطن مشہور کردیا۔ اوسپر اہل وطن نے کچھ اس طرح دل بڑہایا کہ کچھ نہ پوچھئے۔ لکھنو۔ دہلی۔ بنارس وغیرہ کی بہت سیر کی مگر ہنوز جی نہیں بھرا۔ جیسے حضرت اوستاد فرماتے ہیں کہ ؎

اور میں جنکو ہے اسے تسلیم شاگردی پہ ناز
میں نسیم دہلوی کے کفش برداروں میں ہوں

اوسی طرح ہیچمدان بھی اپنی شاگردی پر فخر کرتے کرتے مر جائیگا

وہ صلواتیں ... تو چنانچہ یہ ہے کہ بھی کہا جاتا ہے کہ گستاخیکر
چونکہ یہی بتا خوب ہے نہیں عدم تہذیب کی پیروی کرنا بہتر تھا۔ بقول قلق
بنا کر نیکی پھر اُسے مجھ سے دین کے حلقہ کو تنگ جب نفس انسانی غرض جس کے قطعہ
پھر سے کل شرکت ہے جہاں ان سے چھوڑ دی کیا کہ ان غزلیں گانے کے قابل کچھ
قصور نہیں۔

فیضِ خواب

تذکرۂ یادگار ضیغم میں ضیغم سلمہ لکھتے ہیں کہ حضرت تسلیم مدظلہ نے نسیم دہلوی کو خواب میں دیکھا کہ وہ بہ نظرِ اصلاح ایک شعر کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یوں نہیں یوں کہو۔ اس بارہ میں میں نے اوستاد سے پوچھا آپکا بیان ہے کہ یہ خواب سنتو میں نے دیکھا نہ کسی نے کہا معلوم نہیں ضیغم کو کیونکر معلوم ہوا البتہ اوستاد البتہ یہ فرماتے تھے کہ میں نے مومن خان اوستاد نسیم دہلوی کو تو نہیں دیکھا مگر خواب میں دیکھا اور یہ وہ زمانہ تھا کہ میں مثنوی صبح خنداں کہہ رہا تھا دیکھا کہ چراغ جل رہا ہے اور میں ایک مقام کو پڑھ رہا ہوں کہ مومن خان صاحب تشریف لائے اور مجھ سے کہا کہ مطلب سے اتنا بعید۔ پھر آنکھیں کھل گئیں میں نے اس مقام پر چند شعر بنے ہوئے تھے اور باقی سب نکال ڈالے۔ یا خدا جانے اوستاد نے یہ کس عالم میں فرمایا۔ کہ

اب وہ کہاں تسلیم اگلی شاعری   مر گئے وہ لوگ جن کے تھے لیے

بعض نئی روشنی والے واللہ اعلم میری ان باتوں کو کیا سمجھ رہے ہونگے کیونکہ وہ نیچرل شاعر ہیں اور اصلاح کے خلاف رہنے والوں میں ہیں اور انکا دعویٰ ہے۔ شاگرد کیسا کا ہے کیسا اوستاد انہیں خواب و خیال کی باتوں پر کیا وثوق آسکتا ہے جنہیں اخبار ہی پر شبہ ہے یہ انکے سامنے ایک شعر پڑھ کر الگ ہوجاتا ہوں۔ سن لیں

من کہ باشم عقل کل را ناوک انداز ادب
مرغ او صاف تو از اوج بیانے انداختہ

مزے مزے کی باتیں

ہائے دل نہیں مانتا کیا کروں۔ عرش

باغباں الفت گیسو مجھے لے آئی ہے عشق پیچاں ہے تیرے باغ کی دیواروں پر

ناظرین میری آنکھوں سے دیکھیں اس محفل میں چند جہاں دیدہ بلند پروازی کی بال کی کھال کھینچ رہے ہیں۔ بعض اکڑ کر تکیہ لگائے بیٹھے ہیں بعض عروس کی طرح سنگار کر کے بے اختیار درد و غم بھلا کر ہنسا رہے ہیں۔ اللہ اللہ کیا فارغ البالیاں ہیں خدایا وہ کیسے لوگ تھے کیا اوسوقت بھی یہی دنیا تھی۔ آج تو اون تذکروں کے سننے والے مجھے جھوٹا سمجھ رہے ہیں۔ اون کو کیا کروں۔

حضرت اوستاد ارشاد فرماتے ہیں کہ بلند پروازی کا زمانہ گذر گیا اب تاویل اور استعارہ وغیرہ کوئی چیز نہیں لوگ پرانی لکیر کا فقیر جانکر داد دیتے ہیں عذر مجہول پیش کرتے ہیں کہتے ہیں کہ شاعری ہے کہ مجذوب کی بڑ۔ ہاں رشک مرحوم کے وقت میں یہ ہوا چلی تھی شعرا تمسخر کرنے لگے۔ اور یہ رنگ پسند نہیں کیا۔ منیر مرحوم اور قایل وغیرہ نے اسکو برتا ایک مشاعرے میں قایل نے پڑھا کہ

ے چھرا چلا فلک پہ پتنگ نہ جنگ کا چھوٹا ہے پل گاؤ پہ کتا تفنگ کا

داہل نظر نے بھری ہوئی بندوقیں بہت دیکھی ہونگی اس چھرے کو دیکھیں ادبر چیز ہے۔ ایک چھرا تیر کے دل میں سوراخ کر ڈالے اب منیر مرحوم فرماتے ہیں کہ ع پیچھے پر تیرے پڑیں گورتے کی چھریاں تو سہی۔ آنکا ایک دیوان ہی اسی رنگ سے بھرا ہے داوستاد ناسخ کی تعلیم کا اثر ہے چھری نہیں بھولی اب رشک مرحوم کو مستند اوستادوں اور ناسخ کے ارشد تلامذہ سے ملئیے۔ کہتے ہیں کہ ے

چاول الماس گوشت لخت جگر　　فرقت یار میں پلاؤ نہیں

غرض اوس بازار طریقت اہل مشاعرہ کے لئے خیالی پلاؤ ہی پکا رہے تھے کہ ایک نازک بدن بیگم صاحبہ آگئیں۔ لیجئے انکی خاطر کیجئے مگر یہ تو کچھ اپنے ساتھ گھر سے بخو تحفہ لیتی آئی ہیں۔ ناظرین نے انکو پہچانا۔ لیجئے چہرے

سے کھونکتا او کھتا ہے صاف صاف دیکھ لیجئے۔ اے لاحول ولا قوۃ میں
کس خیال میں تھا۔ یہ نوجوان صاحب ریختی گو ہیں۔ اے لیجئے انکا دعویٰ ہے کہ
استعارہ کی بال کی کھال جو یہ لوگ ہینچ کر مشاعرہ میں چھوڑ گئے ہیں اوسکی کھال
کھینچوں گا۔ آپ کہتے ہیں کہ ؎

اب بدلے شاعری کے فقط رنگینی گلگشت و ایجاد پھنوا انگرکھا ہاتھی کے تھان کا
ہو بہو۔ اس انگرکھے کے آگے ہیبر مرحوم کا وہ کورتا کیا مال ہے غرض یہ سیکڑوں
شعر مہمل کہہ کے جناب رشک کیطرف کہ اوسوقت وہ استاد تھے منسوب
کرنے لگے۔ اوسی پلاؤ تھیں والی طرح میں ایک مطلع کہا کہ

دور سے چھیڑے پلاؤ نہیں رشک۔ بیٹھا ہے بن پلاؤ نہیں

اے سبحان اللہ کیا کہنا۔ مردہ فصحاؤں کی روح قبروں میں بے اختیار پھڑک گئی
ناظرین اب آپ ہی بتائیں جہاں ایسے ہجو پر ہجو ہو وہاں لوگ استعارہ کی
توبہ کرکے گھر چھپ کر نہ بیٹھیں کیا کریں۔ اوستاد نے ان تماشوں کو بری طرح
اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ایسے ایسے سینکڑوں قصے ہیں جنکو طوالت
کے باعث نہیں لکھ سکتا۔ کوئی ان حالتوں کو استاد کے دل سے پوچھے۔
ہیچمدان بھی پہلے ان بزرگوں کے نقش قدم پر چلتا رہا اور استعارہ وغیرہ سے
دلچسپی رکھتا تھا۔ مگر جب سے یہ حالتیں سنیں جی چھوٹ گیا۔ حق یوں ہے کہ
غزل کا مزا سعدی اہلی وغیرہ تک ہو گیا

ایک مطلع اوستاد کا یاد آیا ہے۔ اس سے رشک کے پھولوں کی خوشبو
آتی ہے۔ اوس زمانہ کی روش ہی یہی تھی۔

بلبلیں آمادۂ فریاد ہیں گلزار میں حشر برپا ہو رہا ہے کوچہ منقار میں

مگر مزے میں دودھ اور شربت کا فرق ہے۔ وہاں یہ صفائی اور
لطافت نہیں۔ اہل زبان زبان پر رکھ کر مزا چکھ لیں یہ چیز اور ہے
اور اس میں خداداد تاثیر بہت ہے۔

سرسری محاکمہ

ہیچمدان عرش جو کسی طرح کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔اس اہم کام میں کس طرح
ہاتھ لگائے۔ اور کیا فایدہ کہ خواہ مخواہ دبدہ دیزی بھی کرے۔ اور طعن سنے۔
کہ شاگرد نے اوستاد کو سب سے بڑھا دیا. ہرچند کہ مصنفین نے محاکمہ کیا ہے مگر
اب زمانہ کی حالت اور ہے۔ اسلئے مجبور ہوں مگر چونکہ سوانح عمری میں ایک بات
رہ جاتی ہے اسلئے مجبور ہوکر چند فارسی کہنے والوں کی کلام بلاغت نظام سے
اوستاد کے شعروں کا محاکمہ کرتا ہے۔ اور اردو کہنے والوں کو چھوڑتا ہے کیونکہ
اتیشے اور دیہ سرے فرقہ کیطرح مجھے کسی کی یادگار سے الجھنا نہیں آتا۔
قصیدہ۔ آپکا خاقانی اور عرفی کے رنگ میں ہے اور اگر بہ نظر غور دیکھنے
والے دیکھیں گے تو ایک آدھ جگہ بڑھ گیا ہے اب دو ایک باتیں اور ہیں۔
حاتم الشعرا شیخ علی حزین مرحوم جنکا مزار بنارس فاطمان میں ہے۔
کہتے ہیں کہ آہستہ برگ گل بہ فشاں بر مزار ما ٭
بس نازک است شیشہ دل در کنار ما
شیخ علی حزین کے اوستاد ہونے میں کسکو کلام ہوسکتا ہے مگر ناظرین دیکھیں
یہاں حزین نے دل کے ضعف اور نازک ہونے کو لکھا ہے جو واقعی بدیہی
طور پر بھی نازک ہے اوستاد جسم کی ناتوانی کو لکھتے ہیں کہ بظاہر ہی دل
سے ہزار درجہ قوی ہے ہرچند جسم میں وہ بھی منفعل ہے مگر خصوصیت
نے فرق ڈال دیا ہے۔ تسلیم
ناتواں وہ ہوں کہ زیر خاک مدفن بعد مرگ ٭ بار ہے سایہ مجھے مژگان چشم مور کا
حق پسند حضرات سمجھ لیں۔
سعدی کہ اپنے رنگ میں یگانہ گذر گیا ہے اوسکا نہ ماننا بدرجہ کفر جانتا
ہوں۔ مگر ع۔ بات کہنے کی جو ہوتی ہے کہی جاتی ہے۔ سعدی۔ شہر واسط
کی مصیبت کو رو کر خلیج فارس کے مد و جزر کو صرف بڑھاتے ہیں کہتے ہیں کہ
فاما الصوح معی فی مصیبت واسطہ تزید علی مد الخلیجہ والجسر

اوستاد بھر یار بیں روتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ

اوج پر ہے چشم تر کا جوش طوفاں آجکل ✿ ملک کف سیلاب ہے گردون گرداں آجکل

ہر چند بحر اوس معیبت سے سوا ہے مگر اہل درد اوس معیبت کو بحر سے سوا ہی جانتے ہیں یہاں تو وصال کی بھی امید ہے وہاں تو کچھ بھی نہیں شعر احسن بیان اور بلاغت پر نظر ڈالکر موازنہ کرلیں۔

سعدی کا وہ رنگ جو سہل و شمع سے عجیب رنگ ہے۔ اس رنگ میں بڑے بڑے اہل کمال نے سعدی کا خاکہ اوڑایا مگر داغ تو وہ نقش تھا۔ اور تھا بھی تو رنگ بھرنا باقی تھا۔ سعدی ایک چیز کے مستثنے کرنے کی خوبی کو کیا خوب بیان کرتے ہیں۔

نبودے بجز آہ بیوہ زنے اگر برشدے دودے از روزنے

اوستاد نے اسی رنگ میں مثنوی صبح خنداں میں شکارگاہ کے مقام پر فرمایا ہے کہ نہ باقی رہا کوئی طایر وہاں

مگر نام کو ایک زاغ کماں

یہاں پر اوستاد سے وہ کام ہوا جو علی حزیں سے نہ ہوسکا۔ بہرکیف اس سے میرا مدعا یہ نہیں ہے کہ اوستاد ان اساتذہ سے سوا ہیں یا یہ اساتذہ کچھ نہ تھے۔

موجودہ دماغی کیفیت

میرے دوستوں نے باغ میں جاکر اکثر کھلے ہوئے پھولوں کو دیکھا ہوگا۔ ہر پھول اپنی طاقت کے مطابق سرسبزی دکھلاکر کمھلا جاتا ہے۔ نظر بازوں نے تاروں کو دیکھا ہوگا۔ رات بھر اپنی درخشانی پر نازاں ہوکر صبح سویرے چراغ سحر سے بھی زیادہ اوداس نظر آتے ہیں۔ اس اعتبار سے سمجھنا چاہیے کہ انسان کی قوت بھی ضعیفی تک گویا زایل ہوجاتی ہے۔

حضرت اوستاد کی عمر کی بابت میں لکھ چکا ہوں کہ قریب سو

برس کے ہے۔ اور ستر پچھتر برس کی مشق ہے۔ یہ اوس باغ کا پھول ہے جس کو
انقلاب نے خزاں ہوکر خاک میں ملا دیا۔ مگر اوسکی شان کہ یہ پھول جسکو میرے
باغبان قدرت نے ایک موزون گلدستہ بناکر ہندوستان کی زیبائش کے
لئے رکھا ہے اب تک سرسبز ہے کیونکہ میری آنکھوں کے آنسو اسکے لئے شبنم
ہیں گو پھر بھی خزاں زمانہ کا اثر اتنا ضرور ہے کہ یہ گلدستہ کبھی کبھی پژمردہ معلوم
ہوتا ہے۔

یہاں پر حضرت اوستاد کے ایک سرفراز ناموں کا خلاصہ نقل کرتا ہوں۔

(۱) محبی مشفقی منشی ضمیر الدین احمد عرش زاد عنایتکم۔ بعد سلام سنت الاسلام
کے مظہر مدعا ہوں آپکی غزل دیکھکر پانچ دن ہوئے کہ روانہ کر چکا اپنی حالت کیا
لکھوں نوے برس سے زیادہ عمر ہے تو وہ بعد ارشد باقی ہے : وہ سماعت
عینک میں لکھنو سے لے آیا تھا سو ہو ہے مگر وہ دوربین نہیں ہے لکھنے میں
کام نہیں دیتی اوسپر بھی کتب خانہ سپرد ہے میں اپنا دوسرا دیوان بھی جمع کر رہا
ہوں ۲۷ جزو لکھ چکا ہوں اغلب کہ ۳۰ جزو ہو جائیں

رقیمہ نیاز محمد امیر اللہ تسلیم از رامپور

(۲) غزل آپکی دیکھکر منشی اعزاز الدین کو درج گلدستہ حدیقۂ عامدی کے لئے
دے دی وہ کہتے ہیں کہ میں پرچہ برابر بھیجتا ہوں۔ واللہ اعلم۔ اور اس طرح
میں پرزور غزل کہکر بھیجئے ؎

جنت سے بدل جائے جہنم تو مزا ہو

(چنانچہ ہیچمدان نے دوران علالت میں ایک مختصر غزل بھیجی تھی جو گلدستہ
مذکور میں درج ہے اوستاد کی اس ذرہ نوازی پر مجھے فخر ہے) میں دیکھکر بیان
مالک گلدستہ کو درج کیلئے بھیجدونگا کیا کروں لوگ خواہ مخواہ دق
کرتے ہیں یہاں مہینے میں چار مشاعرے ہوتے ہیں جناب امیر لکھنوی کی
خاطر سے صرف شرکت بھی ضرور ہے مگر اب شعر و شاعری کیا کروں ہر وقت
موت نگاہ میں پھرتی ہے چاہتا ہوں کہ آخر وقت تو خدا کا نام لوں۔
بقول سعدی

اے کہ پنجاہ رفت درخوابی مگر ایں پنج روز دریابی

۹ ذی الحجہ ۱۳۱۸ ہجری رقیمہ نیاز امیر اللہ تسلیم از رامپور

میرے دوستوں پر ان سرفرازناموں سے پورا حال ظاہر ہوگیا ہوگا۔ ہرچند ضعیف ہیں مگر شوق سخن باقی ہے اور آجتک کلام عیوب سے پاک ہے۔ اور تاریخ گوئی کہ جس سے بڑھکر دماغ سوزی اور طرح کے نظم میں شاعر کے نزدیک نہیں ہے اوس میں بھی ابتک آپکو کمال ہے۔ آپ کی تازہ غزل درج ذیل کی جاتی ہے۔

غزل اوستاد تسلیم

تھک گئے ہم حسرت ذوق شہادت کم نہیں
ہے دم بسمل اگر تیغ ستم میں دم نہیں

دردمندان ازل رکھتے نہیں درماں کا غم
سینۂ صد چاک گل منت کش مرہم نہیں

روز مرتے ہیں ہزاروں تیغ ابرو دیکھ کر
گر یہی عالم تمہارا ہے تو یہ عالم نہیں

شادی و غم کا نہیں رکھتے کچھ اصلا دل
خانۂ آئینہ میں نغمہ نہیں ماتم نہیں

مر مٹے ہم عشق کے شہرے وہی ہیں آجتک
شور رسوائی پس مردن بھی اپنا کم نہیں

نالۂ آتش فشاں جو ہیں اگر ہیں اوج پر
تو نہیں اے آسمان فتنہ گر یا ہم نہیں

بعد مردن خاک ہی ہو جائیگا کنج گور میں
اپنا بیگانہ نہیں مونس نہیں ہمدم نہیں

سیکھ آئے ہو کہاں سے آج یہ بیگانگی
تم نہیں وہ یار جانی یا وہ عاشق ہم نہیں

بے ثباتی پر بہار باغ کے روتا ہے چرخ
برگ گل پر اشک کے قطرے ہیں شبنم نہیں

بیخودی کا ہو برا کیسے پشیماں آج ہیں
آپ آئے آپ میں بدقسمتی سے ہم نہیں

خط کے آجانے سے حسن و عشق رخصت ہوگئے
اب لگاوٹ کس لئے وہ تم نہیں وہ ہم نہیں

پیستی ہے بعد مردن گور میں دشمن کی طرح
یہ زمیں بھی آسیائے آسماں سے کم نہیں

پائمالی کسی کی مرکے بھی آتی ہے یاد
بے سبب اوگتا لحد پر پنجۂ مریم نہیں

وقت پیری کیا کریں تسلیم ہم فکر سخن
دل میں وہ قوت نہیں کس بل نہیں دم خم نہیں

کلیات امیر اللہ تسلیم کو چھپے ہوئے سنہ ۱۲۸۹ھ و سنہ ۱۳۱۹ھ کے

سے پچیس برس کا زمانہ گذر گیا عمر شریف کے اعتبار سے اوس زمانہ میں آپ ضعیف ہو چکے تھے مگر ذوق جوان تھا خود فرماتے ہیں کہ

پیر ہوں پر ہے جوان ذوق غزل خوانی ہنوز۔ لطف دیتی ہے مجھے میری سخندانی ہنوز

رنگ قدیم کو کیا پوچھئے جو وہ زمانہ ہی مضمون زا مشاعرے کا تھا۔ اس زمانہ جہالت میں کہ فارسی عربی جاننے والے مشکل سے ملتے ہیں اور نا فہم یا انگریزی دانوں کا شمار تاروں سے زیادہ ہے مگر اوستاد مرحوم کا رنگ نہیں جاتا اور ایسا خوشنما رنگ ہے۔ جیسے کسی حسین کے گورے گالوں کی ذرا سی سرخی کہ خواہ مخواہ دل کو بیقرار کر دیتی ہے۔ زبان پر مضمون کا ہلکا رنگ ایسا موزوں ہے جیسے پلکوں پر آنسو نہ گلاب کے پھول پر پھاڑ۔

میں کچھ اگلا کلام یہاں پر درج کرتا ہوں۔

بھولے سے بھی نہ جانب اغیار دیکھنا ‍ ‍ ‍ ‍ خم ہو وفا ہی ہے خبردار دیکھنا
مانند شمع بیٹھ کے طے کی رہ عدم ‍ ‍ ‍ ‍ یارو یہ معجزہ ہے کہ رفتار دیکھنا
اٹھتی ہے روح دل سے دم نزع ہوشیار ‍ ‍ ‍ ‍ ہستو عدم کو جاتے ہیں گھر بار دیکھنا
الصدر ہے اضطراب تمنائے دید یار ‍ ‍ ‍ ‍ فرصت میں اک نگاہ کے سو بار دیکھنا
میری خطا نہیں ہے خدایا جو کچھ کہوں ‍ ‍ ‍ ‍ پھر چھیڑتا ہے زاہد مکار دیکھنا
تسلیم روئے یار کو حسرت کی آنکھ سے
اچھا نہیں ہے شوق میں ہر بار دیکھنا

اور کیا کا ہیدہ ہوتا لاشہ مجھ کمزور کا ‍ ‍ ‍ ‍ سایہ ہے پائے نعش مژگان چشم مور کا
کھلتے کھلتے شمع کے مانند آخر جل بجھا ‍ ‍ ‍ ‍ منھ نہ دیکھا میرے لاشے نے دہان گور کا
سوز غم سے ہوں میں افتادہ سراپا آبلہ ‍ ‍ ‍ ‍ شیر کا ناخن مجھے ناخن ہے پائے مور کا
دیکھنے کے صاف دل جتنے ہیں سب کے قیمتی ہیں ‍ ‍ ‍ ‍ خانۂ آئینہ میں حصہ نہ دیکھا چور کا
ضعف میں افتادگی زندان سی ہم کو نہیں ‍ ‍ ‍ ‍ طوق ہے گردن میں حلقہ موج آہ مور کا
کوئی صدمے سے فلک شکوہ زبان تک آگیا ‍ ‍ ‍ ‍ میں لب تصویر ہوں خوگر نہیں ہوں شور کا
تیرہ دل کو نفع کیا تسلیم شو صاف سے
دیکھنا بیکار ہے آئینہ چشم کور کا

سے قدیم صحبت کا اثر ہے رشک کا زمانہ تھا

قریب کام ہے وقت پر نہیں آتا | بجھانے دل کی لگی کو جگر نہیں آتا
کہاں گئے جو عیادت پہ جان دیتے تھے | مزار میں کوئی لینے خبر نہیں آتا
حجاب دیدۂ نرگس سے باغ میں نہ کرو | یہ دیکھنے کی ہیں آنکھیں نظر نہیں آتا
خیال تمام ہے اپنے سے منقطع ہوتا | صدف کے کام کسی دن گہر نہیں آتا
اجل خفا ہے فلک مدعی زمیں دشمن | مرا جہان میں کوئی نظر نہیں آتا
ہنسا ہیں کیا تیری اٹکھیلیاں کہ ہنوز | تجھے وہ ناز نسیم سحر نہیں آتا

ابھی سے کیا کریں دعویٰ شاعری تسلیم
یہ کام وہ ہے کہ جو عمر بھر نہیں آتا

ہائے دلی تیری بھولی صورت نہیں بھولتی ہے
پژمردہ ہو گئے گل رخسار ہائے ہائے

دلی تباہ ہوگئی مگر وہ باتیں نہیں بھولتیں۔ اوستاد بھی ہرچند کہ لکھنو کے متوطن ہیں مگر دلی ہی پر فخر ہے۔ کہتے ہیں میں ہوں تسلیم شاگرد نسیم دہلوی۔ مجھکو طرز شاعران لکھنو سے کیا غرض۔ یوں تو ہر غزل میں دلی کی بو آتی ہے مگر ایک آدھ غزل اوسی رنگ کی درج بھی کرتا ہوں۔

غزل

میں اہل صفا بھی ہوں تو کیا ہوں | آئینے کی طرح خود نما ہوں
اس بزم جہاں میں صورت شمع | غیروں کے لئے میں جل بجھا ہوں
نکہت ہوں مگر چمن سے چھٹ کر | برباد میں صورت صبا ہوں
ہوں آہ دل حزیں جہاں میں | جینے میں کمال نارسا ہوں
میں کیا کہوں لطف سیر عالم | ہوں خواب میں خواب دیکھتا ہوں
حال دل گم شدہ ہوں کہتا | افسانہ طراز آشنا ہوں
کم حوصلہ شوق دل نہیں ہے | ہوں تجھے جسقدر میں چاہتا ہوں
کیوں شرط وفا اسی کا ہے نام | تم تو کرو رشک میں بنا ہوں
افسانۂ دوستی ہوں تسلیم | دشمن کا مگر سنا ہوا ہوں

چند جدید تاریخیں حضرت تسلیم کی کہی ہوئی بغرض نمونہ انکشاف حالات دماغ اپنے ناول
اور دیوان سے نکال کر درج کی جاتی ہیں یہ ہمدان عرش کو اک فخر ہے

تاریخ دیوان نظم نونگار مصنفہ عرش

زہے اوج فکر فلک سیر عرش — سراپا ہے الہام جس کا سخن
کیا جمع دیوان عجب نظام — ہوا سرمۂ چشم اہل زمن
کہیں گوندہی رنگ سے لالیاں — بھرا ہیں لفظ و زبان دہن
کہا فکر تسلیم نے بہر سال — یہ دیوان ہے فخر ارباب فن
۱۳۱۷ھ

ولہ

زہے عرش دیباچہ شیوا بیان — کلامش چو اعجاز فرخ سرشت
کنون داد ترتیب منظوم خویش — چو گلدستۂ بزم باغ بہشت
پئے سال تسلیم شوریدہ سر — ہمہ خوب و بے مثل دیوان نوشت
۱۳۱۷ھ

تاریخ ناول ثمرۂ نافرمانی مصنفہ عرش

یہ افسانہ ایسا لکھا عرش نے — کہ ہر اہل معنے کو محبوب ہے
نہیں پوربی گفتگو جو مدام — زباندان کے نزدیک معیوب ہے
کہی ہمنے تسلیم تاریخ طبع — یہ بے مثل ناول چھپا خوب ہے
۱۳۱۷ھ

معذرت

مجھے نہایت رنج اور افسوس سے لکھنا پڑتا ہے کہ حیات تسلیم کو جس شوق اور دلی خواہش سے میں نے اپنے معزز دوست حضرت عرش کو لکھنے کی تکلیف دی تھی۔ چند ایک مجبوریوں کے باعث حسب مدعا اسکو اچھی طرح چھپوا نہ سکا کچھہ میری بیماری۔ عدیم الفرصتی پرائیویٹ مصروفیت اور سفر اور کچھہ کاتب صاحب اور مطبع والوں کی مہربانیوں نے ہندوستان کے مشہور شاعر حضرت تسلیم اور انکے کثیر التعداد شاگردوں اور فن سخن گوئی کے بیشمار شائقوں کو نہایت صدمہ پہونچایا افسوس ہے کہ میں جلدی میں غلطنامہ بھی ترتیب نہ دے سکا دوسرے ایڈیشن میں انشاء اللہ تعالے تمام شکایتیں دور کردیجائینگی اور لکھائی چھپائی نہایت نفیس ہوگی اور اصل بات بھی یہ ہے کہ ع نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول +

نیازمند محمد الدین فوق ایڈیٹر اخبار پنجہ فولاد لاہور